1755

Acc No. 27641

ستاروں کے سائے

عنوان
ST 01
IM

افسانے

ALLAMA IQBAL LIBRARY
27641

پنڈت شِورام شرما

پبلشر
ماہ نامہ شعلہ و شبنم۔ دریبہ کلاں دِلّی ۶
(کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

عنوانات

نمبر شمار		نمبر صفحہ
۱	کیا دو گے؟	۵
۲	فرض	۳۸
۳	مادھر ملن	۶۷
۴	شیاما	۸۷
۵	ستاروں کے سائے	۱۱۹

کیا دو گے؟

کل بھوشن کے ہاتھ سے قلم گر پڑا فائیل جو اس کے ساتھ تھی بات گو پیچیدہ نہ تھی۔ کسی شخص نے بوگس مرمٹ پاس کرا کر انگلینڈ سے مال منگوایا تھا۔ کسٹم سے مال بعد ادائیگی محصول نکل چکا تھا۔ جب یہ علم ہوا کہ پرمٹ جعلی ہے۔ انکوائری باقاعدہ ہو چکی تھی اب اُس کا آفس نوٹ کل بھوشن نے تیار کرنا تھا۔ اس کا دماغ پریشان تھا۔ اس نے کئی بار نوٹ لکھا مگر چند سطور لکھنے کے بعد اس کو چاک کر دیا تھا کہ آج شام تک فائیل کو مکمل صورت میں صاحب کی میز پر ضرور پہنچانا چاہیئے۔ اسکی ہدائیت صاحب نے کل بھوشن کو بُلا کر پہلے ہی روز کر دی تھی۔ لیکن آج اس کا پچیس سال کا تجربہ اس سے بے رُخی اختیار کر رہا تھا۔ وہ اس پیچیدہ معاملہ میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اُس نے پھر قلم اُٹھایا۔ نوٹ مکمل تو کر لیا۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے کیا لکھا ہے؟ فائیل کو چپراسی کے ہاتھ صاحب کے پاس بھیج دیا۔

صاحب نے فائیل کو پڑھا اور چپراسی سے کل بھوشن کو بُلانے کے لئے کہا۔

یہ نوٹ آپ نے لکھا ہے؟

جی جناب۔

تو اسی قابلیت پہ آپ ترقی مانگا کرتے ہیں؟

میں نے سوچ سمجھ کر لکھا ہے جناب۔

اچھا تو ذرا پڑھو اسے۔

کمل بھوشن نے جونہی نوٹ پڑھنا شروع کیا اس کا جسم پسینے سے تربتر ہو گیا۔ وہ خود حیران رہ گیا کہ اس نے یہ کیا لکھا ہے۔

معاف کیجئے جناب۔ مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ میں آج صبح سے ہی تذبذب میں تھا اسی حالت میں یہ نوٹ لکھا۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔

بھوشن تم ایک پرانے ہیڈ کلرک ہو۔ اگر تم اس طرح لاپروائی سے کام کرو گے تو ایک نہ ایک دن ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑینگے۔ جاؤ اور کل شام تک مکمل نوٹ لکھ کر پیش کرو اور آئندہ کیلئے محتاط رہو۔

بھوشن کمرے سے باہر آیا۔ چہرہ پہ اداسی۔ سر نیچا کئے ہوئے آکر کرسی پر بیٹھ گیا قلم اٹھایا اور نوٹ لکھنا شروع کیا۔ گھڑی نے رات کے دس بجائے۔ لیکن وہ ابھی نوٹ مکمل کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں چوکیدار نے آکر کہا۔

صاحب! آج گھر نہیں جائینگے؟ دس بج گئے ہیں۔

دس؟

ہاں جناب دس بجے ہیں۔

کمل بھوشن نے جلدی جلدی نوٹ مکمل کیا۔ ایک دفعہ پڑھا۔ پھر پڑھا۔ اب اس کو

واشو اس ہوا کہ نوٹ بینی بروا قعات ہے۔ لہٰذا فائیل کو صاحب کی میز پر رکھ کر دفتر سے باہر نکلا اور پا پیادہ گھر کو چل پڑا۔ سوچنے لگا کہ کیا میری دونوں لڑکیاں کنواری رہینگی؟ کوئی بھی اُن کے ساتھ شادی نہ کرے گا؟ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں جو منہ مانگا جہیز لڑکے والوں کو دے سکوں۔ بارات کے کھانے کے اخراجات برداشت کر سکوں مہیش نے بی۔ اے پاس تو کر لیا ہے۔ لیکن ابھی تک اُس کو بھی ملازمت نہیں ملی ہے جو کماتا رہا مہیش کی پڑھائی کملا اور نرملا کی تعلیم پر خرچ کرتا رہا۔ یہی خیال کیے تھا۔ کہ لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوں گی۔ گھر کے کام کاج سے واقف ہوں گی۔ اُن کی شادی کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ لیکن جہاں بھی بات کرتا ہوں پہلے تو پوچھتے ہیں "کیا دو گے؟" اُن کو کیا معلوم کہ میرا یہ ٹھاٹھ باٹھ بناوٹی ہے۔ صرف اپنی ہیڈ کلرکی کو برقرار رکھنے کے لیے دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں۔ گھر میں کرسیاں اس لئے رکھی ہوئی ہیں۔ کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم نہ ہو کہ بھوشن اندر سے کھوکھلا ہے۔ لیکن یہ بناوٹی شان و شوکت کب تک قائم رہے گی؟ کب تک میں یہ ڈھونگ رچائے رکھوں گا۔ کب تک یہ سفید پوشی قائم رہے گی۔ انہی خیالات میں غرق وہ گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اِس کو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کتنا راستہ چل آیا ہے۔

سروج نے کھانا نہ کھایا تھا وہ بھوشن کے انتظار میں رسوئی میں ہی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ دفتر سے دیر سے آیا کرتا تھا۔ اِس لئے وہ اتنی تشفکر دکھائی نہ دیتی تھی۔ جونہی دروازہ کی کنڈی کو بھوشن نے ہلایا سروج نے فوراً اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

دفتر میں کوئی ضروری کام ہو گیا تھا یا لالہ۔ ادھے شیام کے ہاں گئے تھے؟

اس وقت تو دفتر سے ہی آرہا ہوں۔ صبح جاتے وقت مجھے رادھے شیام راستے میں ہی

مِل گئے تھے۔

تو بات پکّی ہو گئی ہو گی؟

پکّی کیا سروج کچّی بھی نہیں ہوئی۔ وہ بیچارا خود پریشان تھا۔ مگر کیا کرے۔

ایسا کیوں؟

آجکل کی اولاد جو نئے زمانے کی ہوئی۔ دُوسرے لڑکوں کی شادیاں دیکھتے ہیں تو اُن کو بھی خیال آتا ہے کہ وہ بھی شادی وہاں کریں جہاں سے خوب دھن اور دولت ملے۔ یہی بات رادھے شیام کے گھر کی ہے۔

تو کیا اس نے انکار کر دیا ہے؟

اس کے اختیار میں ہے ہی کیا! جو انکار کرے یا اقرار کرے۔ اُس نے تو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے۔ کہ کنول کی چٹھی آئی ہے لکھا ہے کہ وہ جلد آنے والا ہے۔ لڑکی کو خود دیکھے گا۔ دوسرے لڑکی والے کیا دینگے؟ اب تم ہی بتاؤ سروج تم کیا دے سکتی ہو؟ جو ایک کو دیں گے دُوسری کو بھی وہی دینا ہو گا۔

تو کیا میری ایک لڑکی کے بھی ہاتھ پیلے نہ ہوں گے؟

ہوں گے ضرور۔ لیکن ممکن ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں۔

ایسا کیوں کہتے ہو ناتھ؟ ان بیچاریوں نے کون سا اپرادھ کیا ہے؟ جن کی سزا انکو ملے کرم تو ہمارے بُرے ہیں۔ جن کے یہاں اُنہوں نے جنم لیا۔

مہیش چارپائی پڑا سب کچھ سُن رہا تھا۔

میں دو دن رات اپنی خیالات میں ڈوبی رہتی ہوں پاس پڑوس آکر یہ کہتی ہیں کیا ارادہ ہے۔ لڑکیوں کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گی۔

تو کچھ جواب نہیں دے سکتی۔ وہ تو یہی جانتی ہیں کہ اِن کے پاس بہت کچھ ہے۔

سروج زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب قسمت ہی روٹھی ہوئی ہے تو سب باتیں سننا پڑتی ہیں۔ میں نے تو اب یہی سوچا ہے کہ پہلے مہیش کی شادی کردوں اور جو اس کی شادی میں ملے اِس سے کملا کو سُسرال بھیج دوں۔ رہی بملا۔ وہ ابھی چھوٹی ہے۔

لیکن مہیش تو ابھی نوکر بھی نہیں۔ ہوا گھر کا خرچہ پہلے ہی مشکل سے چلتا ہے۔

تو کیا ہوا بی۔ اسے پاس ہے جلد نوکر ہو جائے گا! اس کی فکر مجھے نہیں۔ فکر ہے تو کملا کی۔ میں سوچتی ہوں کہ بڑی بہن کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کی شادی۔ محلے والے کیا کہیں گے اور پھر کملا کیا سوچے گی!

محلے والوں کی کون سُنتا ہے۔ گھر اپنا دیکھنا ہے ابدر ہی، کملا کی بات۔ یہ سب کچھ تو اُسی کے لئے ہی کیا جا رہا ہے۔

میں پھر بھی ڈرتی ہوں نا تھ۔ اگر بہو رانی نے اپنے جہیز سے ایک چیز بھی نہ دی تو پھر کیا ہے گا؟

مہیش۔ ایسا نہیں سروج۔ وہ اپنی بہنوں کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔

مہیش کو ریلوے میں جگہ مل گئی چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد وہ گارڈ مقرر ہو گیا کئی ایک گھرانوں سے سگائی کے سندیش آنے شروع ہوئے۔ لیکن کل بھوشن نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کیا۔ وہ اب یہ جانچ کر رہا تھا کہ کس گھر سے زیادہ ملنے کی اُمید ہو سکتی ہے۔

مہیش کی ڈیوٹی بمبئی میل تھی۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ کہ لکایک کسی نے زنجیر کھینچی اور گاڑی آہستہ ہو کر رک گئی۔ مہیش اپنے کمپارٹمنٹ سے اترا اور وجہ معلوم کرنے کیلئے جس کمپارٹمنٹ کا ویکیم ٹوٹا تھا وہاں پہونچ گیا۔ کمپارٹمنٹ فسٹ کلاس تھا۔ اور اُس میں ایک نوجوان لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ اسکے ہاتھ سے زنجیر چھوٹ چکی تھی۔ مہیش فوراً کمرہ کے اندر گیا۔ لڑکی کو اُٹھایا ہوش میں لانے کی کوشش کی چند منٹ بعد اُرملا نے آنکھیں کھولدیں۔ لیکن وہ ہنوز نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی گاڑی کافی لیٹ ہو چکی تھی۔ پچھلے سٹیشن سے ریلوے پولیس کا سٹاف پہنچ گیا تھا اس گاڑی کو اگلے سٹیشن پر لے جانے کا آرڈر اس نے لیا۔ گاڑی چل پڑی۔ مہیش اسی کمرہ میں بیٹھا تھا۔ اُس نے زندگی میں نوجوان حسن کو اس قدر خوبصورت پہلی بار پایا تھا۔ وہ اپنے ہوش۔ حواس کھو چکا تھا۔ اتنے میں اُرملا نے انگڑائی لی اور مہیش کو سامنے بیٹھا دیکھ کر آنکھیں ملنی شروع کر دیں۔

کیا حادثہ ہوا ہے؟

بتاتی ہوں۔ لیکن آپ کون ہیں؟

میں گارڈ ہوں اور یہ ریلوے پولیس کانسٹبل ہیں اُرملا نے تفصیل بتائی میں دہلی سے روانہ ہوئی ہوں اور بمبئی جا رہی ہوں۔ اس کمرہ میں ایک اور ادھیڑ عمر آدمی کی سیٹ ریزرو تھی۔ دہلی سے جونہی گاڑی روانہ ہوئی اس نے اپنا بکس کھولا اور چند ایک رسالے نکال پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے ڈر تو ضرور تھا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ یہ کوئی امیر آدمی ہے۔ اور پھر میرے باپ کی عمر کا ہے۔ میں نے نہ تو اس سے دریافت کیا۔ کہ کہاں جاتا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ لیکن اس کی شکل وصورت اور وضع قطع سے کچھ

دیتا تھا کہ وہ کوئی بیوپاری ہے۔ میں کھانا کھا کر سو گئی۔ ابھی پُوری طرح سوئی بھی نہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھا۔ پہلے وہ باتھ رُوم میں گیا۔ وہاں سے نکلا تو سیدھا میری برتھ کی طرف آیا۔ اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ جُونہی اسکا ہاتھ میرے جسم کو لگا میں اُٹھ بیٹھی۔ وہ گھبرا گیا۔ اُس نے اپنا سُوٹ کیس اُٹھایا۔ میں نے زنجیر کو پکڑا۔ اس نے میرا گلا دبایا۔ اسکے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

وہ بدمعاش ضرور پکڑا جائے گا۔ پولیس اُسکی تلاش میں سرگرداں ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے کمپارٹمنٹ میں جاؤں۔ کانسٹبل صاحب کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ یہ آپ کے کمپارٹمنٹ کی نگرانی رکھیں گے۔

نہیں نہیں گارڈ صاحب میں اکیلی اس کمرہ میں نہیں بیٹھ سکتی مجھے یا تو لیڈی کمپارٹمنٹ میں جگہ دے دیجئے یا پھر اپنے کمرہ میں۔

میں دیکھتا ہوں اگر کسی لیڈی کمپارٹمنٹ میں کوئی برتھ خالی ہو تو آپ کا بندوبست کر دوں گا ورنہ مشکل ہے۔ مہیش نے گاڑی کا چکّر لگایا۔ اگر وہ چاہتا تو برتھ کا بندوبست کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے دِل میں محبّت کی چنگاری سلگ اُٹھی تھی اور اس کا دھواں دماغ تک پہنچ رہا تھا۔ اُس نے آکر اُرملا سے کہا۔ کہ دوسرے کسی کمپارٹمنٹ میں کوئی برتھ خالی نہیں ہے۔

تو پھر مجھے اپنے کمرہ میں ہی جگہ دے دیجئے۔

ہاں جگہ تو دیدوں۔ لیکن اگر کسی نے چیک کر لیا تو نوکری سے جواب مل جائے گا۔

آپ کو نوکری سے جواب نہیں ملنے دوں گی گارڈ صاحب۔ اس کا بوجھ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

اچھا تو آیئے۔

اُرملا گارڈ کے کمپارٹمنٹ میں چلی تو گئی لیکن اس کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ بھی تو مرد ہے۔ اگر ایک بوڑھے کے دل میں ہلچل مچ سکتی ہے تو نوجوان کا دِل کب قابُو میں رہ سکتا ہے؟ پھر اس کو خیال آیا کہ یہ گارڈ ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کرے گا تو فوراً پکڑوا دونگی ساری عمر یاد رکھے گا۔ کسی سے پالا پڑا تھا۔

مہیش ایک دو سٹیشن اپنے کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ لیکن نہ معلوم اُسے کیا خیال آیا کہ وہ وہاں سے اُٹھ گیا اور ڈرائیور کے پاس چلا گیا۔ جوں ہی سٹیشن آتا۔ اُتر کر گاڑی کا چکر لگا کر اپنے ڈبہ میں جا کر اُرملا کو دیکھ لیتا۔ آخر ناگپور سٹیشن آگیا۔ چائے کا وقت تھا۔ مہیش نے چائے کا آرڈر دیا۔ سیرا چائے اُرملا کے پاس آکر چھوڑ گیا۔ اتنے میں مہیش بھی آگیا۔

تو آپ نے چائے کا آرڈر دیا ہے؟

جی ہاں۔

مجھے تو ضرورت نہ تھی اور نہ ہی خالی چائے پینے کی عادت ہے۔

آپ کو ضرورت نہ تھی۔ لیکن مجھے تو تھی۔ اچھا تو آپ کیلئے کیا منگاؤں؟

یہاں ہو گا ہی کیا۔ لائیے چائے کا کپ۔

لیکن آپ تو خالی چائے نہیں پیا کرتیں۔ میں خود لائے دیتا ہوں۔

اگر گاڑی چل پڑی تو؟

میں گارڈ ہوں بغیر وسل کے گاڑی نہیں چل سکتی۔ تو جایئے جو آپ کو اچھا لگے لے آیئے۔

کھانا تو آپ نے ہے۔ آپ کو کیا پسند ہے۔

میری پسند کیا ہے جو آپ کو مل سکتا ہے لے آیئے۔

مہیش جاکر ٹوسٹ اور مکھن کی ٹکیہ لے آیا اور ٹرے میں رکھ دی۔

اُرملا نے دو کپ چائے کے بنائے اور ایک مہیش کی طرف سرکا کے کہا۔

لیجیے رگھوناتھ صاحب! مہیش نے کپ لے لیا لیکن ٹوسٹ نہ اُٹھایا۔

اُرملا نے ٹوسٹ لیا اور کھانا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ٹوسٹ اور مکھن کھانے کی عادت نہیں ہے۔ اور ہے بھی ٹھیک صبح سویرے کھا لینے سے بھوک مر جاتی ہے۔

جی ہاں۔

اُرملا نے دوسرا ٹوسٹ بھی اُٹھا لیا۔ مُنہ کے پاس لے جاکر پھر ہاتھ مہیش کی طرف بڑھایا۔ یہ لیجیے آپ کا حصّہ ہے۔

یہ بھی آپ ہی کھا لیجیے۔

اچھا تو میں ہی کھائے لیتی ہوں۔ مجھے تو ابھی کافی بھوک ہے۔

اگلے سٹیشن پر اور لا دوں گا۔

بہت اچھا۔

اب تو آپ کو ڈر نہیں ہو گا؟

اب ڈر کا ہے کا آپ گارڈ ہیں اور یہاں کون آ سکتا ہے۔ آپ اور پولیس والے نگرانی بھی تو کرتے ہیں۔

اچھا تو میں جاتا ہوں۔

یہ کمرہ تو آپ کا ہی ہے پھر آپ کہاں جاتے ہیں؟

ڈرائیور کے پاس۔

یہاں ہی بیٹھے رہیئے۔ کیا مجھ سے آپ کو خوف لگتا ہے۔؟

"مجھے تو نہیں لیکن آپ کو تو لگتا ہوگا۔"

اب میں نہیں ڈرتی۔ آپ ریلوے کے ملازم ہیں۔ ایک منٹ میں آپ کو گرفتار کروا سکتی ہوں۔

اسی لیے تو بھاگتا ہوں کہ کہیں نوکری سے جواب نہ مل جائے اور خواہ مخواہ حوالات کی سیر کروں۔

"حوالات جانے سے نام روشن ہوتا ہے گارڈ صاحب"۔

مہیش کمرہ سے باہر جانے لگا۔ ارملا نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔ بیٹھے۔ ایک ملزم تو بھاگ گیا۔ اب دُوسرے کو بھلا کب بھاگنے دوں گی۔

مہیش کا رنگ زرد ہو گیا۔ چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سوچنے لگا کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔ محبت کا جو نقشہ دل میں کھینچا تھا فوراً حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ مہیش خاموش بیٹھا تھا۔ بات کرنے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی باہر جانے کی۔

ارملا زور زور سے ہنسی۔ گارڈ صاحب کچھ معلوم ہوا۔ عورت سے ہمدردی کا کیا صلہ ملتا ہے۔؟

"سب معلوم ہے۔ اسی لیے تو عورت کو بے وفا کہتے ہیں"۔

"بے وفائی تو میں نے نہیں دکھائی۔ اسٹیشن آجانے دیجیے دل کے ارمان پورے کر لوں گی۔"

مہیش بالکل خاموش رہا۔

ارملا نے مہیش کو کندھے سے پکڑ کر کہا۔ گھبرا گئے گارڈ صاحب! بس ایک ہی بات سے؟ میں تو مذاق کر رہی تھی۔

مذاق بھی کیا خوب تھا میرا تو خون ہی سوکھ گیا تھا۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔
آپ نے اپنا دِل خوش کر لیا۔
آپ ناراض ہو گئے، گارڈ صاحب! مُعاف کر دیجیے۔
اچھا معاف کیا۔ اب تو جانے دیجیے۔
جانے تو میں دوں گی نہیں۔ اکیلے میں ڈرتی ہوں اور پھر باتیں کرنے والا تو بھی کوئی ہونا چاہیئے۔
اچھا لیجیے باتیں کیجیے۔
گارڈ صاحب! آپ کا نام؟
کیا پولیس میں رپٹ لکھوانی ہے؟
پولیس میں نہیں اپنی ڈائری میں لکھنا ہے۔ تاکہ پھر کبھی آنے کا اتفاق ہوا۔ تو آپ کا نام پوچھ لیا کروں۔ سفر آرام سے کٹ جایا کرے گا۔
"یہ بات ہے۔ لیجیے میرا نام اس کارڈ پر لکھا ہے یہ میرا شناختی کارڈ ہے۔"
"اگر یہ چوری ہو جائے تو؟"
"تو کیا۔ نوکری سے معطل اور جُرمانہ۔"
"آپ نے تو اسے یونہی پھینکا ہوا ہے۔"
"مجھے خدشہ نہیں چوری کا"
مہیش بابو! چور کارڈ نہیں چُرایا کرے وہ تو سب سے قیمتی چیز پر ڈاکہ ڈالا کرتے ہیں
جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کٹنے والا یاد کرتا رہے۔
آپ نے تو اپنا نام بتلایا ہی نہیں۔

"نام پوچھ کر کیا کرینگے آپ کی گاڑی میں ہر روز کئی عورتیں سفر کرتی ہیں کیا آپ سب کا نام پوچھا کرتے ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر میرا نام کیوں پوچھتے ہیں آپ؟"

"میرا نام بھی تو کبھی کسی نے نہیں پوچھا۔ جب آپ نے پوچھا تو مجھے بھی ہمت ہوئی"

مہیش بابو! ایسی ہمت نہ کریں۔ اُرملا تو مصیبت ہے مصیبت۔ اُرملا ہنس دی اور مہیش کو بھی ہنسی آگئی۔

مہیش دوسرے سٹیشن پر کچھ فروٹ خرید لایا۔ اور گاڑی کو جھنڈی دکھادی گاڑی چل پڑی۔ اُرملا نے کھڑکی سے جھانکا۔ مہیش ابھی پلیٹ فارم پر ہی کھڑا تھا اُرملا نے آواز دی۔

مہیش بابو۔ گاڑی جارہی ہے۔ جلدی کریئے ورنہ رہ جائیں گے۔

مہیش ہنس دیا۔ اور دوڑ کر جیسا کہ اس کا ہر روز کا کام تھا اپنے ڈبہ میں سوار ہو گیا فروٹ اُرملا کے سامنے رکھ کر کہا

"لیجئے کھایئے۔"

"کیا تنخواہ آج ہی ختم کر دینگے مہیش بابو؟"

"تنخواہ تو نہیں اُرملا۔ سفر خرچ کے پیسے ہیں۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"دہلی میں۔ اور آپ؟"

"بمبئی میں۔ فاصلہ بہت دُور کا ہے"۔

لیکن مجھے تو ہر ہفتہ ایک بار بمبئی آنا ہوتا ہے۔ اور ۲۴ گھنٹے ٹھہرنا بھی پڑتا ہے"

آپ نے شادی تو کر لی ہوگی؟

شادی کے جھگڑے میں کون پڑے اُر ملا حال ہی میں تو ملازمت ملی ہے۔ پہلے بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ اُن سے فارغ ہو کر پھر شادی کی سوچوں گا۔

"گھرانا تو طے کر لیا ہوگا؟"

"گھر تو دیکھا نہیں۔ لیکن لڑکی کو دیکھا ہے"۔

"خوبصورت ہوگی؟"

"ہاں خوبصورت تو ہے ہی"۔

"تو وہ آپ کا انتظار کرتی رہے گی؟"

"کرے تو نہ سہی۔ میں تو انتظار کروں گا"

"اگر شادی نہ ہوئی تو اسی طرح زندگی گذر جائے گی"۔

پھر شادی میں رکھا بھی کیا ہے۔ مصیبتوں کا بوجھ اور بس ——

ٹھیک کہتے ہو مہتہ بالو! اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ کی ڈیوٹی بمبئی میل پر ہوتی ہے یا کسی دوسری گاڑی پر بھی؟

"ابھی ایک ماہ اسی پر رہے گی۔ اسکے بعد جہاں بھی لگ جائے"۔

"بمبئی میں کہاں ٹھہرا کرتے ہیں آپ؟"

اسٹیشن پر۔ گورنمنٹ نے ہمارے لئے ویٹنگ روم جو بنائے ہیں۔ دن بھر شہر کی سیر کی۔ شام کو آ کر سو گئے۔ اور دوسری صبح پھر گاڑی اور ہم۔

"تو آئندہ آپ ہمارے ہاں آجایا کریں"۔

نہیں اُرملا میں صبر حالت میں ہوں۔ بہت ٹھیک ہوں۔ زمانہ بڑا نازک ہے۔
چلئے گارڈ صاحب یونہی سہی مگر مجھے تو میرے مکان پر پہنچا دیں گے نا۔ میں تو پہلی
بار بمبئی جا رہی ہوں۔ پتاجی نے یہاں کام شروع کیا ہے۔ پہلے تو کام نرم تھا۔ لیکن اب
اچھا ہو گیا ہے۔ مجھے چٹھی لکھی تھی کہ مکان کرائے پر لے لیا ہے۔ آجاؤ۔ پتہ اس کارڈ پر لکھا
ہے۔ بمبئی میں مجھے بھی نوکری مل جائے گی۔ بی۔ اے۔ پاس ہوں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے دل
اُداس رہتا ہے۔ یہی سوچا ہے کہ نوکری کر لوں۔
بہت نیک اِرادہ ہے اُرملا دیوی۔

گاڑی بمبئی پہنچ گئی۔ اُرملا نے مہیش سے کہا مجھے گھر پہنچا دیجئے۔ مہیش انکار نہ کر سکا
مجھے ایک گھنٹہ فارغ ہونے میں لگے گا۔ آپ ویٹنگ روم میں اتنی دیر آرام کیجئے۔
چنانچہ اُرملا ویٹنگ رُوم میں جا کر بیٹھ گئی۔ مہیش نے گاڑی کا چارج دیا۔
اسٹیشن ماسٹر سے اجازت لی۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور ویٹنگ رُوم میں آیا۔ اُرملا آنکھیں بچھائے
انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ ایک گھنٹے سے دس منٹ زیادہ ہو چکے جب مہیش کمرہ میں
داخل ہوا۔
"معاف کرنا دیر ہو گئی اُرملا دیوی"۔
"معاف نہیں کیا جا سکتا سزا تو ضرور ملے گی مہیش بابو۔!"
"پتاجی اسٹیشن پر آئے ہوں گے۔ دیکھ واکھ کر چلے ہوں گے۔
"آپ کے آنے کا ان کو پتہ۔ تھا؟"
"میں نے چلتے وقت تار جو دے دیا تھا"۔

تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ اور میرا انتظار کیوں کیا۔

اِس لئے نہیں بتایا کہ آپ پھر میرے ساتھ نہیں جائینگے۔ انتظار اس لئے کیا کہ آپ کُچھ تک تو اور میرا ساتھ دیں۔

اچھا تو آپ مجھے ساتھ لیجانا چاہتی ہیں۔ چلو ولیمی جی چلو۔

مہیش اُرملا کے ساتھ باہر آیا۔ ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ گئے۔ اُرملا کی آنکھوں میں مستی چھا گئی مُسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"مہیش بابو۔ اب آپ کی گاڑی کب بمبئی آئے گی۔؟"

"کیا آپ نے پھر دہلی سے آنا ہے؟"

"دہلی سے تو نہیں آنا یونہی پُوچھ لیا ہے۔"

کل شام کو یہاں سے گاڑی واپس لے جاؤنگا۔ جتنا وقت آنے میں لگا۔ اتنا ہی جانے میں لگیگا۔ اِسکے بعد پورے بیس گھنٹہ وہاں آرام۔ اور پھر وہاں سے روانگی۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگلے سوموار کو یہاں آپ کی گاڑی پھر پہنچے گی۔

"حساب لگا لیجئے"۔

ٹیکسی اپنی رفتار سے جا رہی تھی کہ یکایک ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ اُرملا جو اُچھلی تو مہیش پر جا گری۔ مہیش نے اُسے اُٹھایا نہیں۔ اور نہ ہی اُرملا نے اُٹھنے کی کوشش کی اُرملا سنبھلی تو مہیش سے آنکھیں چار کیا ہوئیں گویا وہ تو ہوش و حواس ہی کھو بیٹھی ٹیکسی سڑکوں کا چکر کاٹتی کاٹتی ایک عالی شان بلڈنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یہ ہے نشا بلڈنگ۔ اُرملا نے اپنا گھر آجانے کی اطلاع دی۔

"اُتریئے مہیش بابو"۔

"اب آپ گھر پہنچ گئی ہیں۔ مجھے چھٹی دیجیے"۔

"چھٹی اس طرح نہیں مل سکتی۔ میرا سامان اوپر لے چلیے"۔

مہیش نے چپکے سے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ قلی اتنے میں وہاں آگیا۔ سامان اس کے سر پہ رکھا اور چل دیئے۔ ڈرائیور کا کرایہ دینا بھی بھول گئے۔ ڈرائیور نے پیچھے سے آواز دی ـــ بابو جی کرایہ؟

"مہیش بابو! کیا کرایہ نہیں دیا"۔

مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ مہیش نے واپس آکر کرایہ دیا۔ دل میں کہنے لگا اچھی مصیبت گلے پڑی۔ اب شام کے کھانے کا خرچہ بھی پاس نہیں رہا۔

تیسری منزل پہ فلیٹ تھا۔ جو ارملا کے پتا نے کرایہ پہ لیا ہوا تھا۔ کمرہ میں معمولی سامان تھا۔ جس سے اُن کی مالی حالت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔ کمرہ میں ایک چارپائی اور دو کرسیاں۔ ایک چھوٹی سی پائی رکھی تھی۔

مہیش کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"مہیش بابو! اب تو آپ یہاں ضرور آیا کریں گے۔ میں آپ کا انتظار کیا کروں گی"۔

"کوشش کروں گا۔ لیکن ....."

لیکن کیا۔ او ہیں سمجھی۔ آپ کی نسبت کسی اور سے ہونے والی ہے نا آپ ڈرتے ہیں نہیں ارملا۔ یہ بات نہیں میری کسی سے نسبت نہیں ہوئی اور نہ ہی جلد کرنے کا ارادہ ہے۔ تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ سکتی۔

مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں مہیش بابو۔

مہیش آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اس نے اجازت لی اور چلا آیا۔

مہیش چلا تو گیا۔ لیکن دل وہاں ہی چھوڑ آیا۔ سٹیشن پہ پہنچا کسی جگہ بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ادھر سے اُدھر پلیٹ فارم پر چکر کاٹنے لگا۔ شام ہو گئی وہ ابھی پلیٹ فارم پر ہی گھوم رہا تھا کہ اُرملا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ خوشی سے دل ناچنے لگ گیا۔ اور قدم خود بخود اس کی پیشوائی کے لئے اُٹھ گئے۔

"مہیش بابو! نمستے"۔

نمستے کیا کوئی صاحب تشریف لا رہے ہیں"۔

جی نہیں۔ بھولے سے آپ کا یہ کارڈ میرے پاس رہ گیا تھا واپس کرنے آئی ہوں۔

"تو آپ نے چوری کر ہی لی"۔

جی۔ جب آپ کارڈ سے ڈاکو بن گئے تو کیا میں چور نہیں بن سکتی؟

"میں نے آج تک ڈاکہ نہیں ڈالا اُرملا دیوی"۔

"مہیش بابو! آپ کیا جانیں"۔

"اچھا دیوی جی! میں کچھ نہیں جانتا۔ بتایئے اب کیا سیوا کروں"؟

"مجھے چوپاٹی کی سیر کرا دیجئے۔ سُنا ہے کہ دیکھنے کی جگہ ہے"۔

ہے تو دیکھنے کی۔ لیکن اگر یہ پروگرام اگلے سوموار پر رکھیں تو کتنا اچھا رہے گا؟

کیوں؟ روپے جو ساتھ لائے تھے خرچ ہو گئے۔ یہی ہے نا بات۔ میں اس کا انتظام کرا لائی ہوں۔

اچھا دیوی جی چلئے۔

اُرملا اور مہیش ٹیکسی میں چوپاٹی جا پہنچے۔ چاندنی رات میں وہ ایک دوسرے

کے جذبات کا جائزہ لیتے رہے۔ دونوں پر بے خودی طاری ہو گئی تھی۔ ان کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور ان کا آس پاس میں کیا لگاؤ ہے۔ مہیش جلدی سنبھل گیا۔

"ارملا۔ ارملا"

"کیا ہے مہیش بابو!"

"کچھ نہیں۔ اب میں جاؤں گا۔ ورنہ پاگل ہو جاؤں گا ارملا! پاگل"

چلئے میں آپ کو سٹیشن چھوڑ آتی ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کو دل میں لئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

مہیش دہلی تو آگیا۔ لیکن دل یہیں ہی چھوڑ آیا۔ ساتھ لایا درد دل۔ اور وہ بھی بیٹھا بیٹھا۔ آنکھوں کے سامنے ارملا کی تصویر گھومتی اور وہ تن بدن کی سدھ بھلا دیتا چوبیس گھنٹے گذرنے مشکل ہو گئے۔ کہ بھوشن نے مہیش کو بتایا کہ چار جگہ سے لڑکی کا پیغام آیا ہے۔ امیر گھرانے ہیں۔ لڑکیاں بھی خوبصورت ہوں گی۔ تم اپنی ماں کے ساتھ جا کر خود دیکھ لو۔

"لیکن" مہیش نے کہا۔

پتاجی! ابھی تو میرا ارادہ شادی کا نہیں ہے۔

بیٹا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اپنے لئے نہیں۔ تو اپنی بہنوں کے لئے ہی سہی۔ اگر تم شادی نہ کرو گے تو کملا کی شادی جو اب جوان ہو چکی ہے اور جس کا اب گھر میں رکھنا برا ہی اور دنیا میں بدنامی کرانے کے مترادف ہے کیسے ہو گی؟ مجھے تیری شادی کی فکر نہیں، جتنی کملا کی شادی کی ہے۔ کملا کی شادی کے لئے روپیہ چاہیئے نا۔

پتاجی! وہ میں ایک دو سال میں اکٹھا کر کے دے دونگا۔ خود بھوکا رہوں گا ایک روپیہ بھی فضول خرچ نہ کروں گا اور تب تک ایک وقت ہی کھانا کھایا کروں گا جب تک کہ کملا اور بملا کی شادی نہیں ہو جاتی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹا! شادی پر کافی روپیہ چاہیئے۔ کم از کم دس ہزار تمہاری تنخواہ سے دس ہزار کیسے بچے گا۔ میں ساری عمر ایک ہزار روپیہ جمع نہ کر سکا۔ تم کس طرح سے کر دو گے مہیش بیٹا۔ ہاں کہہ دو میری اُمیدوں کا خون نہ کرو۔ تمہاری ماں جو دن رات اسی فکر میں بیمار رہتی ہے اس کا بھی خیال کرو۔

"پتاجی مجھے سوچنے کا موقعہ تو دیجیے"۔

"اتنے میں سروج بھی آ گئی۔

کیا باتیں ہو رہی ہیں آج باپ اور بیٹے میں؟ میں بھی تو سنوں۔

کیا باتیں ہونی ہیں۔ میں نے مہیش کو شادی کے لیے کہا تھا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے میں ابھی شادی نہیں کرونگا۔

کیا کہا بیٹا! تم نے تو لڑکی بھی دیکھ لی ہے بہت خوبصورت ہے۔ شریف ہے۔ میٹرک پاس ہے۔ امیر گھرانہ ہے۔ شادی میں کافی جہیز بھی آ جائے گا جس سے میری آرزو پوری ہو گی۔

"ماں! سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر میں بھی تو سوچ لوں"۔

"ہماری سوچ دگی میں تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کوئی تمہارے دشمن تھوڑے ہیں۔ والدین ہر دم اولاد کی بہتری ہی سوچا کرتے ہیں۔ اور پھر تم تو ہمارے اکلوتے بیٹے ہو"۔

"ماں! مجھے ایک دو دن کی تو مہلت دیجیے"۔

کل بھوشن اور سروج نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ اس کا انہیں خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ مہیش ایسا جواب دے گا۔ وہ رات بھر نہ سوئے اور ٹھنڈی آہیں ہی بھرتے رہے۔ اُدھر مہیش نے بھی تمام رات کروٹیں بدلتے ہی کاٹ دی۔ صبح ہی وہ سٹیشن پر چلا گیا اور گاڑی کا چارج لے لیا۔

گاڑی تو اپنی رفتار سے جا رہی تھی۔ لیکن مہیش کے خیالات کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ جہاں منٹ کیلئے بھی کہیں نہ رُکتے۔ اُس کی آنکھوں میں اُرملا کی تصویر تھی اور دماغ میں والدین اور اُن کی پریشانی دونوں کی کشمکش میں اس کے چہرے کی رونق کافور ہو چکی تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل سے گاڑی لے جا رہا تھا۔ اُس کو یہ بھی ڈر تھا کہیں اس کی زندگی کی گاڑی کسی حادثہ کا شکار نہ ہو جائے اور وہ کہیں کا نہ رہے۔ آخر گاڑی بمبئی سٹیشن پر پہنچی۔ مہیش دروازہ میں کھڑا تھا۔ پلیٹ فارم پر اُرملا کو خوبصورت ساڑھی میں ملبوس کھڑے ہوئے دیکھا۔ اُس نے وہیں سے ہی کہتے کیا۔

"آ گئے مہیش بابو؟"

"جی! لیکن آپ یہاں کیسے؟ کیا کسی نے دِلی سے آنا ہے؟"

"جی ہاں! مہیش بابو نے"۔

دونوں ہنس دیئے۔ مہیش بابو جلدی چارج دے دیجیے میں انتظار کرتی ہوں۔

"بہت اچھا میں ابھی آیا"۔

مہیش نے گاڑی کا چارج دیا۔ اور جلدی ہی اُرملا کے پاس پہنچ گیا۔ آج اُرملا کتنی خوش تھی۔ اس کا اندازہ اس کی بار بار کی مسکراہٹ سے لگ رہا تھا۔

"آپ نے سٹیشن پر آنے کی تکلیف کیوں فرمائی"؟

"مجھے شک جو تھا کہ آپ ہمارے ہاں نہیں آئینگے"۔

"اب تو شک نہیں رہا؟"

"ہے اور نہیں بھی"۔

"اچھا جانے دو ان باتوں کو۔ بمبئی کی سیر تو خوب کی ہوگی!"

"میں نے گھر سے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ صرف آج ہی نکلی ہوں۔ اور وہ بھی آپ کے لیے"

اُرملا دیوی! مجھے معاف کرنا میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ارمانوں سے کھیلوں اور آپ کی زندگی برباد کروں۔ مجھے آپ بھولنے کی کوشش کیجئے۔

"میں بھولنے کی کوشش کروں یہ آپ کہہ رہے ہیں"۔

ہاں میں کہہ رہا ہوں اُرملا! اور ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ مہیش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"آپ رو رہے ہیں"۔

"ہاں میں رو رہا ہوں اپنی بدقسمتی پر"

"وہ کیوں؟ قسمت تو اچھی ہے نوکری ہے۔ نوجوانی ہے۔ تندرستی اور پھر خوبصورتی بھی۔ رونا تو مجھے چاہیئے جس کے پاس کچھ بھی تو نہیں"۔

"اُرملا! میں مذاق نہیں کرتا۔ ٹھیک کہتا ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ"۔

"مہیش بابو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ"۔

"میں تمہاری پاک محبت کے قابل نہیں میں شادی نہیں کر سکتا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم شادی نہ کرو محبت نہ کرو۔ لیکن مجھے کیوں روکتی ہو؟"

"یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ تمہاری زندگی بھی میرے ساتھ برباد ہو جائے گی"۔

"ہو جانے دو"۔

محبت بربادی ہے نہیں ڈرا کرتی مہیش بابو۔ عورت جب ایک بار قدم اٹھا لیتی ہے تو پیچھے نہیں ہٹایا کرتی خواہ اس میں موت کا بھی سامنا ہو جائے۔

اچھا۔ میں نے پرن کیا ہے کہ جب تک اپنی دو جوان بہنوں کی شادی نہ کر دوں گا اپنی شادی نہ کروں گا۔ اور ممکن ہے کہ اسکے لئے مجھے دو چار سال تنگدستی سے ہمکنار ہونا پڑے"۔

"یہ بھی کوئی مشکل بات ہے مہیش بابو"

"مشکل تو ہے ہی۔ زمانہ بیرحم ہے وہ نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کھانے کو بھی ہے یا نہیں۔ لیکن شادی میں پوچھتے ہیں کیا دو گے۔ پتاجی ہیڈ کلرک ہیں اڑھائی سو لیتے ہیں۔ گھر کا خرچ ہے۔ میری تنخواہ بھی تو یہی ڈیڑھ سو ہے۔ کب دس ہزار ہوں گے تو ان کی شادی ہوگی اور میں سبکدوش ہوں گا"۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں سے آپ کو دس ہزار روپیہ ملے گا وہاں شادی کر لیجئے۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے رملا! ہرگز یہ مطلب نہیں بلکہ پرن ہے کہ جب تک دس ہزار روپیہ اکٹھا نہ کر لوں گا شادی نہیں کروں گا"۔

"میں نے بھی تو پرن کیا ہے مہیش بابو کہ شادی کرونگی تو آپ سے ورنہ نہیں ٹھیک ہے نا۔ ہم دونوں کا پرن پورا ہوگا نہ ہم ایک دوسرے کے ہونگے۔ اسی لئے

تو کہتا ہوں کہ ابھی سے مجھے بھول جاؤ۔
بھول جاؤں گی مہیش بابو! اگر تم کہتے ہو تو بھول جاؤں گی لیکن مرنے کے بعد
اُرملا جانِ آرزو اُرملا۔۔۔! مجبوریاں ارمانوں کا خون کر دیتی ہیں۔ یہ میں نہیں
جانتا تھا۔

اُرملا سکول میں ٹیچر سس ہو گئی پہلی تنخواہ ملی کتنی خوش تھی وہ۔۔۔ ہر سوموار کو اُرملا سٹیشن پر پہنچ جاتی لیکن مہیش بابو کی جگہ کسی اور گارڈ کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا اُمنڈ آتا اور وہ مُردہ دِل سی گھر پہنچتی۔ مہیش نے اپنا تبادلہ کلکتہ میل پر کرا لیا تھا ایک دو چٹھیاں مہیش نے اُرملا کو لکھیں لیکن اِس کے بعد وہ سلسلہ بھی بند ہو گیا اُرملا ہر روز مہیش کی چٹھی نکال کر پڑھ لیتی اور یاد تازہ کر لیتی۔ دِن گذرتے گئے اُرملا نے چند لڑکیوں کی ٹیوشن بھی کر لی۔ اور اِس سے آمدنی میں اضافہ ہو گیا اُدھر مہیش بھی دِن رات کو لھو کے بیل کی طرح ڈیوٹی دیتا اور ٹائم لگاتا۔ اور ہر طرح سے جلد سے جلد دس ہزار روپیہ اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کئی کئی دن گھر بھی نہ جاتا۔

سروج کو کملا اور بملا کا غم کھائے جا رہا تھا۔ جو بھی عورت اُس سے ملتی کہتی ہیں سروج! کملا اور بملا دونوں ایک ساتھ جوان ہو گئی ہیں کب تک اُن کی شادی کرو گی؟ اس باپ کی زندگی میں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو جانے چاہئیں۔ ورنہ کیا بھروسہ۔ کوئی کہتی زمانہ نازک ہے بہن۔ نوجوان لڑکیوں کو لوگ بدنام کرتے ہیں اور پھر شادی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہر روز کی باتیں سُن سُن کر سروج زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ اندر

ہی اندر غم دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا وہ۔ ہلکا ہلکا بخار بھی آتا تھا لیکن پھر بھی وہ گھر کا کام کاج کرتی رہتی تاکہ ڈاکٹر وغیرہ کو دوائی کے لئے کچھ دینا نہ پڑے آخیر بخار تیز ہو گیا۔ اور سروج چارپائی سے اُٹھنے کے بھی قابل نہ رہی

کل بھوشن کا دماغ پہلے ہی پریشان رہتا تھا دفتر میں کام دل لگا کر نہیں کرتا تھا اور ہر روز دو ایک بار صاحب سے جھاڑ وپڑ جاتی۔ آخر تنگ آ کر ایک دن صاحب نے لکھ دیا کہ آج کل بھوشن کا دماغ صحیح کام نہیں کرتا اس کا ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے اور اگر واقعی سروس کے نااہل سمجھا جائے تو اس کو ریٹائر کر دیا جائے۔

ڈاکٹر نے کل بھوشن کے خلاف ہی رپورٹ کی اور اس کو سروس سے ریٹائر ہونے کا آرڈر مل گیا۔ گھر میں سروج کی بیماری۔ نوکری سے جواب۔ کل بھوشن کا دماغ چکرا گیا۔

مہیش نے کافی سمجھایا۔ اور اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اب تک اُس نے تین ہزار روپیہ اکٹھا کر لیا ہے اور چھ ماہ کے اتنا ہی اور ہو جائے گا۔ کملا کی شادی خوب دھوم دھام سے کر دیں گے۔ لیکن کل بھوشن اور سروج پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ایک شام کو سروج اس جہان فانی کو چھوڑ کر راہی عدم ہو گئی۔ کل بھوشن پہلے ہی پریشان رہتا تھا۔ اب سروج کی موت نے اُسے دیوانہ بنا دیا۔ ہر ایک بات پر غصہ آ جاتا۔ مہیش جب کبھی سامنے آتا تو یہی کہتا۔

"بیٹا۔ تیری وجہ سے تیری ماں مر گئی۔ کملا اور بملا کی شادی نہیں ہوئی۔ اب کیا میری جان بھی لو گے؟"

مہیش کی زندگی تلخ ہو چکی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ زندگی کو ختم کرنے سے پہلے

ایک دفعہ اُرملا سے مِل آئے۔ لیکن پھر بھی وہ جا نہ سکا۔ کئی بار اُس نے گاڑی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کمزور دِل تھا یہ بھی نہ کر سکا۔

گاڑی لکھنؤ سٹیشن پر پہنچی۔ ٹکٹ چیکر نے ایک سادھو کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا سبب پُوچھا۔ تو سادھو نے جواب دیا۔

بیٹا۔ دُنیا میں جن کو دولت سے پیار ہوتا ہے۔ دولت اُن کے پاس ہوا کرتی ہے ہم سادھوؤں کے پاس تو ایک ہی دھن ہے اور وہ ہے پربھو لگن۔

مہاراج! تو پھر دُنیا یہ دھن دولت کیوں اکٹھا کرتی ہے؟

چند دِن کی زندگی کو کانٹوں میں پھنسانے کے لئے۔

اگر تمام دُنیا دھن دولت اکٹھا کرنا چھوڑ دے تو دُنیا کا نظام اور کاروبار کیسے چلے گا مہاراج!

دُنیا کا کاروبار صرف دھن دولت سے ہی نہیں چلا کرتا بیٹا! اس میں پربھو کی شکتی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر دھن دولت ہی زندگی کا سہارا ہوتا۔ تو دُنیا کب کی ختم ہو جاتی انسان جو چاہتا کرتا۔ جس کو چاہتا غلام بنا لیتا۔ لیکن نہیں۔ بھگوان کی کئی آنکھیں ہیں۔ وہ ہر ایک انسان کے بھلے بُرے کرموں کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اور جب پاپ کی کمائی سے ناؤ بھر پُور ہو جاتی ہے تو وہ کسی نہ کسی شکل میں آکر اُس کو ڈبو دیتا ہے۔ لیکن بھگوان کی بھگتی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ غریبوں، محتاجوں کو دیا ہوا ایک پیسہ بھی مصیبت کے وقت کام آتا ہے۔

مہاراج! تو دُنیا کے کام بغیر دھن کے کیوں ادھورے رہتے ہیں اور انسان کیوں دُکھ اُٹھاتا ہے۔

یہ ایک گورکھ دھندہ ہے بیٹا۔ گرہستی اپنے جیون کے لیئے بال بچوں۔ ماں باپ۔ عورت اور اس کے علاوہ اپنے سوارتھ کے لیئے دھرم۔ کرم۔ پاپ۔ پُن اور بھلائی برا سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ دھن بٹورنے کے لیئے وہ نیچ سے نیچ کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ ماں باپ۔ بال بچے۔ استری۔ رشتہ دار سب سُکھ کے ساتھی ہیں۔ دھن دولت کے پُجاری ہیں۔ جب یہ دیہہ چھُوٹ جائے گی کوئی ساتھ نہ دے گا۔ اس وقت مُردہ جسم کو ایک دِن کے لیئے بھی اپنے پاس نہ رکھینگے۔ جب یہ معلوم ہے کہ انتم دشا کیا ہوگی تو پھر جھوٹی دُنیا کے لیئے کیوں کسی کو کشٹ پہنچائے۔ کیوں جھونٹ بولے۔ کیوں کسی کی آتما کو دُکھ پہنچائے۔

مہاراج! کیا سادھو ہو جانے سے من کو شانتی پراپت ہو جاتی ہے۔؟

محض سادھو بن جانے سے من کو شانتی نہیں ملتی بیٹا! شانتی تو ہری کیرتن میں ہے۔ پر بھو کا نام جپنے میں۔ اس کی من موہنی مُورتی کو آنکھوں میں بسانے میں اور پھر بنی نوع انسان کی سیوا کرنے میں ہے۔

کیا گرہستی بھی سادھو ہو سکتا ہے مہاراج؟

کیوں نہیں ——— آدمی بھگوے کپڑے پہننے سے ہی سادھو نہیں ہو جاتا بیٹا! گرہستی بھی سادھو ہے۔ جب اس کے کرم شُبھ ہیں۔ جب اُس میں بھید بھاؤ نہیں جب اُس میں اُونچ نیچ کا فرق نہیں۔ جب وہ ایک آدمی کی آتما کو اپنی آتما سمجھتا ہے جب اُس کو ایک دوسرے کا کشٹ محسوس ہوتا ہے اور جب وہ دوسرے کو بھوکا دیکھتا ہے تو اس کو اپنی بھوک بھاگ جاتی ہے۔

مہاراج مجھے بھی چند دن اپنے شرن میں رکھ لیجیئے اور ایسا پربندھ کیجیئے کہ میرے

من کو شانتی ملے۔ مہاراج! میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ موت بھی مجھ سے دُور بھاگتی ہے۔

آتم ہتھیا دُربلتا کی نشانی ہے بیٹا! جو دُکھوں سے گھبراتا ہے وہ دُکھوں میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ اور جو شبھ کرموں سے دُکھوں کا مقابلہ کرتا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ تم ابھی بچے ہو۔ زندگی کے چند سال گرہستی کا جیون بتاؤ۔ اس کے نشیب و فراز جانچو۔

اتنے میں گاڑی کلکتہ پہونچ گئی۔ ہوڑہ سٹیشن پر پہونچکر مہاتما کو پلیٹ فارم سے باہر کر دیا اور ساتھ ہی عرض کی۔

مہاراج چند منٹ میرا انتظار کیجیے۔ آپ کے ساتھ رہنے سے میرے من کو کچھ شانتی پراپت ہوتی ہے۔ چند گھنٹے اور ساتھ رہنے کی اجازت دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔

چنانچہ مہیش نے گاڑی کا چارج دیا۔ کپڑے بدلے اور چند منٹوں میں مہاتما کے پاس آگیا۔

"کہاں جاؤ گے بیٹا؟"

"جہاں آپ لے چلیں"۔

"راستہ بہت کٹھن ہے بیٹا! اس پر چلنا کانٹوں سے کھیلنا ہے"۔

"مہاراج۔ جو اس وقت میرے من کی دشا ہے وہ پھولوں کے دُکھ سے کم نہیں"۔

تو چلو۔ جو بھگوان کی اچھیا۔ چند دن امتحان کے ہوں گے بیٹا۔ بھگوان چولا پہنانا ہوگا سکھوں کا تیاگ کرنا ہوگا۔ بھگوان کے چرنوں میں جیون بتانا ہوگا اور سچے اور شُدھ من سے رام نام جپنا ہوگا۔

مہیش نے مہاتما کے چرنوں میں سیس نوایا۔ اپنی پوشاک ایک بھکاری کو دے دی

اور خود ایک بھگوا چولا بنوا کر پہن لیا۔ سر منڈ منڈا کر لیا۔ مہیش نے آئینہ میں خود کو دیکھا اور خود بھی پہچان نہ سکا۔ چند دنوں کے شکلپ سے مہیش کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے من میں چنچلتا کی جگہ شانتی نے لے لی۔ ایک دن صبح سویرے بھگوان کی مورتی کے سامنے بیٹھا ہوا گرو منتر کا جاپ کر رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اُرملا کی تصویر گھومنے لگی۔ بھگوان کی مورتی کی جگہ اُرملا کی صورت دکھائی دینے لگی۔ گرو منتر بھول گیا اور بیہوش ہو کر گر گیا۔ ہوش آیا تو اُٹھ کر چل پڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"مہاراج جا رہا ہوں زندگی کی آخری گھڑیاں ختم کرنے"۔

"لیکن تمہارا گھر تو دہلی میں ہے"۔

ہاں مہاراج! گھر تو دہلی میں تھا اور آتما بمبئی میں ہے۔ یہ کہہ کر مہیش وہاں سے نکل گیا

کمل بھوشن کو جب معلوم ہوا کہ مہیش لاپتہ ہو گیا ہے تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔

مہیش کلکتہ سے سیدھا بمبئی پہنچا۔ سٹیشن سے پیدل چل کر سڑکوں کا چکر کاٹ کر دوپہر کے وقت اُرملا کے مکان پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اِدھر اُدھر سے بھیک مانگی۔ شام ہوئی۔ اُرملا کے مکان کی طرف آ رہا تھا کہ سامنے سے اُرملا آتی دکھائی دی کمزور اور لاغر جسم۔ چہرہ کی رونق ختم ہو چکی تھی۔ اور بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ مہیش نے پاس جا کر کہا۔

کھانے کے لیے سادھو کو بھی کچھ ملے گا؟

"کیوں نہیں بابا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

مہیش ارملا کے ساتھ چل دیا۔ ارملا نے جاکر دروازہ کھولا۔ مہیش کو بٹھایا۔ اور پڑوس والے لڑکے کو آواز دی۔ اُس کو ایک روپیہ دے کر بازار سے پوریاں لانے کو کہا۔

"آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں"۔

"نہیں مہاراج پتاجی بھی ہیں"۔

"آپ نے شادی نہیں کی؟"

"شادی کر کے کیا لینا ہے مہاراج۔ جب دل ہی ٹوٹ گیا ہو"۔

"دل کے ٹوٹنے سے قسمت نہیں پلٹا کرتی دیوی جی!"

"اپنا ہاتھ تو بتاؤ۔ ہم سب کچھ بتا دینگے"۔

"مجھے اب پوچھ کر کیا کرنا ہے مہاراج! جب موت کی گھڑیاں گن رہی ہوں"۔

"اس قدر نراش نہیں ہونا چاہیئے دیوی جی۔ سچّی محبّت کی ہمیشہ جیت ہوا کرتی ہے اس میں بھگوان کی شکتی ہوتی ہے۔ پھر کرموں کا لکھا بھی کوئی مٹا نہیں سکتا"۔

"اپنے کرموں کی ہی سزا مل رہی ہے مہاراج!"

"لیکن ہمیں تو دکھائی دیتا ہے کہ اب دُکھ کے دن ختم ہو چکے ہیں"۔

"یہ کیا کہتے ہیں مہاراج! میں دہلی بھی آئی وہاں سے سُنا تھا کہ وہ لاپتہ ہو گئے ہیں وہ سخت پریشان تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے دس ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اُن کے چرنوں میں بھینٹ نہ کر سکی۔ اُن کی تمنا پوری نہ کر سکی"۔

"مہیش کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے"۔

"مہاراج! آپ کی آنکھوں میں آنسو؟"

"ہاں اپنے کئے کا پھل ہیں"۔

"تو کیا مہاراج! آپ کو بھی دھوکا ہوا ہے؟"

"دھوکا ہوا نہیں بلکہ کسی کو دھوکا دیا ہے۔ کسی کی زندگی سے کھیلا ہوں۔ ارملا کسی کی زندگی سے ــــ"

ارملا نے اپنا نام سادھو کی زبان سے سُنا تو دُور ہٹ گئی اور کہا کہ مہاراج یہ لیجئے ایک روپیہ اور بازار جاکر کھانا کھا لیجئے۔

"لیکن اب مجھے موت بھی تم سے جُدا نہیں کر سکتی"۔

ارملا باہر کو بھاگی۔ مہیش نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "ارملا دیوجی! میں مہیش ہوں مہیش گارڈ ــــ"

ارملا اور مہیش گاڑی پر سوار ہوئے۔ کتنے خوش تھے وہ۔ دس ہزار روپیہ اُن کی جیب میں تھا۔ مہیش کا پرن پورا ہوا تھا۔ ماں کی آخری خواہش کملا اور بملا کی شادی راستہ میں ہی شادی کا پروگرام تیار کیا گیا۔ گاڑی دہلی پہونچی مہیش اور ارملا سیدھے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

کُمل بھوشن چارپائی پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر پاس بیٹھا تھا۔ کملا اور بملا سرہانے کھڑی تھیں کملا کے پوچھنے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ دل کو گہرا صدمہ پہنچا ہے اور اس کا علاج دوا نہیں دُعا ہے۔

اتنے میں مہیش اور ارملا کمرے میں داخل ہوئے۔ باپ کو اس حالت میں دیکھ کر مہیش چارپائی پر جا گرا۔

پتاجی! پتاجی! یہ لیجئے دس ہزار روپے۔ دس ہزار روپے اُٹھئے کملا اور بملا کی شادی بڑی دھوم دھام سے کیجئے۔

کُل بھوشن نے مہیش کی آواز سُنی تو آنکھیں کھولدیں۔ اور کہا بیٹا بہت دیر سے آئے ہو۔ اب تو موت کے بیرحم پنجہ سے چھٹکارا مشکل ہے۔ میرا وقت آگیا ہے۔ دل ہی دل میں رہی کملا اور بملا کی شادی ضرور کرنا بیٹا۔ ضرور کرنا۔ کُل بھوشن نے یہ کہتے ہوئے دم توڑ دیا۔ بیٹیوں ـــــ پرائی امانت کی چنتا نے باپ کو چتا پر پہنچا دیا۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے ع

دنیا بھلا نہ باپ کا بیٹی بھلی نہ ایک

اور کُل بھوشن کو تو ایک نہیں دو کی چنتا لے ڈوبی۔

قرض

میں بھیک نہیں مانگوں گا بابا۔ کبھی نہیں مانگوں گا۔

کیوں بیوقوف بنتے ہو۔ میرا باپ بھیک مانگتا رہا۔ دادا مانگتا رہا میں بچپن سے مانگ رہا ہوں۔ اور تو کہتا ہے کہ بھیک نہیں مانگوں گا۔

ہاں بابا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بھوکا مرجاؤں گا مگر مانگوں گا نہیں۔

میں بھی دیکھوں تمہیں کون کھانے کو دیتا ہے۔ اُتو کہیں کا۔ اتنے میں کلّو گوسائیں کنگلی آ گئی۔

کیوں بگڑتے ہو! بچّہ ہے جس وقت دیکھو ڈانٹ ڈپٹ۔

تُو کیا جانے کہتا ہے، بھیک نہیں مانگوں گا۔ نواب زادہ کا بچّہ ہو گیا ہے۔ ابھی چھوٹا ہے، بڑا ہوگا، پیٹ کھانے کو مانگے گا خود بخود سڑکوں پر کھڑا ہو کر چلائیگا بھگوان کے نام کا "ایک پیسہ"

ماں تم بابا کو کہہ دو کہ وہ مجھے بھیک کے لئے نہ کہے۔

ہاں ہاں نہیں کہیگا۔

نہیں کہوں گا۔ کیوں نہیں کہوں گا۔ میں اکیلا تھوڑے ہی سب کیلئے مانگ سکتا ہوں

اچھا۔ تم اپنے لئے ہی مانگنا میں خود کلّو کے لئے مانگ لایا کروں گی۔

جسوقت دیکھو لاڈ پیار۔ خراب کر دیا ہے تیرے پیار نے۔

جب اِس کا دِل نہیں چاہتا تو کیوں زبردستی کرتے ہو۔

زبردستی کیسی؟ باپ دادا سے یہ کام چلا آرہا ہے۔ اولاد کو سکھانا ماں باپ کا ہی فرض ہوتا ہے۔

کلّو کو جو کچھ مِل جاتا کھا لیتا۔ اُس نے کبھی شکایت نہیں کی کہ اُسے کھانا نہیں ملا۔ معلوم نہیں کہ کیوں وہ جب کار اُس کے پاس سے گزرتی گھنٹوں کھڑا کھڑا دیکھتا رہتا اور سوچتا یہ بھی تو میرے جیسے ہیں۔ اِن کے بھی دو ہاتھ ہیں۔ فرق صِرف اتنا ہے کہ ان کے جسم پر خوبصورت ریشمی کپڑے ہیں اور میرے جسم پر چیتھڑے۔ لیکن جسم کی بناوٹ میں تو کوئی فرق نہیں۔ انہی خیالات میں وہ نہ جانے کتنی دیر غرق رہتا۔

ایک دِن کلّو نے ماں سے پوچھا

"ماں یہ جو کاروں میں بیٹھ کر پھرتے ہیں اِن کو بھگوان نے خاص طور پہ بنایا ہے"۔

"نہیں بیٹا یہ امیر ہیں روپیہ پیسہ ان کے پاس ہے"۔

"تو پھر میں بھی کار میں سوار ہو سکتا ہوں ماں"

"ہاں بیٹا۔ کیوں نہیں لیکن"

"لیکن کیوں۔ ہم بھکاری ہیں۔ کار کا نام لینا بھی ہمارا حق نہیں"۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے"

"تو پھر اور کیا ہے۔ تم دیکھنا ماں۔ ایک دِن میں بھی کار میں بیٹھوں گا"۔
کنگلی ہنس پڑی۔

(۵)

کلّو کا باپ رلی بوڑھا تھا۔ یوں تو اس کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی یہی چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن جوانی میں بڑھاپے نے اپنا تسلط آجمایا تھا۔ کھانے کو سوکھی روٹی اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتی تھی۔ انسان کی صحت کا دارو مدار خوراک اور بے فکری پر ہوتا ہے۔ لیکن رلی کا دونوں سے بیر تھا اس کو کھانسی اس قدر زیادہ تھی کہ جب کبھی اس کا دورہ پڑتا آدھ آدھ گھنٹہ کھانستا ہی رہتا۔ سانجھ کے مانگنے والے اُٹھ کر بیٹھ جاتے سوئے ہوئے جاگ اُٹھتے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ رلی سے ڈرتے تھے بلکہ وہ بھی کسی نہ کسی مرض میں مبتلا تھے۔ اگر آج رلی پر ناراض ہوتے تو دوسرے دِن رلی بھی اُن کی جان کھاتا۔

کلّو نوجوان ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ بھیک نہ مانگتا تھا۔ رلی نے ایک دفعہ نہیں ہزار بار کلّو کو سمجھایا۔ ڈراوں سے ڈرایا۔ لیکن اس کا اثر کلّو پہ کچھ نہ ہوا وہ یا تو پُل کے نیچے ہی پڑا رہتا۔ یا نزدیک ہی ایک باغ تھا اس میں جا کر بیٹھ جاتا۔ لوگ اس کو دیکھ کر دُور سے ہٹ جاتے۔ یہ کیوں۔ اس کے جسم سے اکثر بدبو آیا کرتی تھی۔ کپڑے میلے کچیلے۔ پھٹے پُرانے۔ کلّو نے کپڑوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ وہ یہی سوچا کرتا کہ وہ کس طرح امیر ہو سکتا ہے۔ پڑھا لکھا نہیں۔ ماں باپ کے پاس کھانے کو نہ تھا۔ پڑھاتے کیونکر اور پھر ساتھ کے رہنے والوں کے لڑکے اَن پڑھ تھے۔ بس ذرا سی سمجھ آتے ہی ان کو ماں باپ نے مانگنے کے طریقے لکھا دیئے۔

ایک چھوٹا سا برتن ہاتھ میں دے دیتے اور سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتے۔ جس طرح

چڑیا اپنے بچّوں کو اُڑانا سکھانے کے لئے ان کی رکھوالی کرتی ہے۔ بعض تو چھوٹے بچّوں کی بدولت کافی پیسے اکٹھے کر لیتے۔ وہ اس کام میں اس قدر ماہر ہو گئے تھے۔ کہ جب کسی سفید کپڑوں میں ملبوس آدمی کو گذرتے دیکھتے اُس کے آگے کھڑے ہو جاتے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتے۔

بابو جی۔ کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ یہ دیکھو پیٹ اس میں ایک نوالہ بھی نہیں گیا۔ کیا ڈھنگ آتا تھا۔ اِن کو کہ اشارہ سے ہی پیٹ کو پیٹھ کے ساتھ لگا لیتے۔ کوئی انگلیوں کو ٹھہرا کے کہتا۔ بابو ہاتھ کام نہیں کرتے۔ بھگوان کے لئے ترس کھاؤ۔ تمہارے بچّوں کو دعا دونگا جب ایک آنہ یا ایک پیسہ ان کی ہتھیلی میں آجاتا۔ بس وہ اُنگلیوں کو سیدھا کر کے ہنستے ہنستے بھاگ جاتے۔ اور اپنے کام میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوشیار اور چالاک بننا چاہتا تھا شام کو جو زیادہ پیسے اکٹھے کر لیتا بس اپنی دانشمندی کے پُل باندھتا۔ اس کی باتیں سُن سُن کر کلّو ہنستا۔ اس کے دِل کو صدمہ بھی پہنچتا۔ کتنے بیوقوف ہیں یہ۔ چار چار چھ چھ آنے کی بھیک پر کتنی ڈینگیں مارتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سے کام کر سکتے ہیں۔ اس میں اکثر نوجوان ہیں جو محنت مزدوری بخوبی کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

رملی کی حالت خراب ہوتی گئی۔ بیمار کو آرام چاہیئے۔ علاج کے لئے پیسہ چاہیئے لیکن اس کے پاس نمک کے لئے پیسہ نہ تھا۔ علاج کیسے ہو سکتا تھا۔ غریب کو بیماری تب ہی دباتی ہے۔ جب موت کا بیرحم پنجہ گلا گھونٹنے کے لئے سامنے آتا ہے۔ رملی بھی دو دِن بیمار رہ کر مر گیا۔ اس کو دُکھوں سے نجات مِل گئی۔ مرتے وقت اس کے چہرہ پر کوئی غم نہ تھا۔ کنگلی کو کو بھی کوئی افسوس نہ تھا۔ دُنیاداری کے ناطے چند آنسو اس نے گرائے۔ جو سُکھ کی ایک کرن اپنے سنگھی ساتھیوں کو نہ دے سکا اُسکے لئے چلے جانے پر کس کو افسوس ـــــ کس کو رنج ہوگا۔ ساتھی

بھی خوش تھے۔ چلو ایک تو کم ہوا۔ کلّو کی آنکھوں سے چند قطرے بہے لیکن وہ بھی تھم گئے۔

رلی کے مرنے کے بعد کلّو پر ماں کی ذمہ داری آ پڑی۔ ماں اب بھی سڑک پر ایک پرانا لحاف اوڑھے راہ گذرنے والوں کو واسطہ دیتی۔ بھگوان کے لئے کچھ دے جاؤ۔ بچّہ بھوکا ہے خاوند مر گیا ہے۔ کئی دِن سے بھوکی ہوں۔ ساتھی کلّو کو لعن طعن کرتے۔ دیکھو ماں نکمّوں مرد ہی ہے یہ نوجوان ہے۔ نہ تو بھیک مانگتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی محنت مزدوری کرتا ہے خواہ مخواہ بوڑھی ماں پر بوجھ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ نالائق سے نالائق اولاد بھی ایسا نہیں کرتی۔ باپ مر گیا۔ جوان لڑکا تھا۔ بھیک مانگ کر کفن تو ڈال سکتا تھا۔ مگر وہ بھی سرکار نے ڈالا ماں مر گئی۔ اس کے لئے بھی کفن سرکار ہی دے گی۔ بھگوان ایسی اولاد کسی کو نہ دے

کلّو ہر روز کی باتیں سُن سن کر گھبرا گیا۔ لیکن پھر بھی اُس نے ہاتھ نہ پھیلایا۔ ماں کی حالت دیکھ کر اس کا دِل پاش پاش ہو جاتا۔ لیکن عمر کا بھی تقاضا تھا۔ ابھی بارہویں سال میں اس نے قدم رکھا تھا۔ ماں کے پاس جب دنیا سو جاتی بیٹھ کر رویا کرتا۔ ماں سمجھاتی۔ دیکھ کلّو۔ ہم نے غُربت میں پرورش پائی ہے۔ میرے ماں باپ بھکاری تھے اور میرے باپ دادا اور پردادا۔ یہ مانگنا میرے خاندان سے چلا آ رہا ہے۔ اب اس کو چھوڑ کر تم کہیں بھی کیا سکتے ہو۔ اور سب کچھ کر سکتا ہوں ماں۔ لیکن بھیک نہیں مانگ سکتا۔

اور ہی کام کر لو۔ مجھ سے بھی اب آواز نہیں نکلتی۔ آوازیں لگاتی ہوں۔ لیکن جو تکلیف ہوتی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ پھر دُنیا کتنی بیرحم ہے وہ مرتے دیکھ کر بھی ایک پیسہ نہیں دیتی۔

میں کل سے مزدوری کروں گا۔ ماں تمہیں بھوکوں مرنے نہیں دُوں گا۔ چنانچہ کلّو دوسری صبح ہی پُل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور جو بھی سامان یا سائیکل لے کر آتا اس سے بوجھ

اٹھا کر پل پر چھوڑ آتا۔ اس محنت سے وہ تھک تو ضرور جاتا۔ لیکن دل کو دکھ نہ ہوتا۔ اس کا دل سکھ محسوس کرتا۔ جب کار وہاں سے گذرتی وہ اس کے تصور میں سب کچھ بھول جاتا۔

ایک دن لالہ گوردھن داس کار سے اترا۔ ایک سوٹ کیس تھا۔ کلو نے زبردستی سوٹ کیس کو اٹھالیا۔

تم ابھی چھوٹے ہو دوسرے کو دے دو۔

نہیں لالہ جی میں لے چلوں گا۔ ماں بھوکی ہے۔

اگر گر گیا تو یاد رکھنا۔

نہیں لالہ جی گرے گا نہیں۔

کلو نے سوٹ کیس اٹھالیا۔ لیکن وہ وزنی تھا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔ لیکن پھر بھی ہمت نہ ٹوٹی۔ جونہی تین چار سیڑھیاں چڑھا دھڑام سے گر گیا۔ سوٹ کیس چھاتی پر پڑا سیٹھ گوردھن داس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اوپر سے لاتوں مکوں سے مرنا شروع کر دیا۔ کرنے سے چوٹ تو پہلے ہی آئی تھی لاتوں کی مار سے وہ بیہوش ہو گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔

"مار دیا غریب کو لالہ نے مار دیا"۔

"پولیس کو کیوں نہیں بلاتے"۔

دولت کے نشہ میں انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔

ایک آنہ دینا ہوگا۔ غریب کی جان لے لی۔ ہوش آجائیگا جب ٹھکڑی لگے گی۔

لالہ گوردھن داس کلو کی حالت دیکھکر گھبرا گیا۔ اگر سوٹ کیس گر گیا تو کیا نقصان ہو گیا۔ لالہ کا رنگ زرد ہو گیا۔

کلّو کو ہوش نہ تھا سر پر چوٹ آئی تھی اور سینہ پر بھی۔ اتنے میں پولیس کانسٹبل آگیا

یہ ہے وہ لالہ۔ جس نے بیچارے غریب کو اتنا مارا کہ بیہوش ہو گیا۔ غریب تھا محنت

کر کے پیٹ پالتا تھا۔ مار دیا غریب کو۔

میں نے تو اس سے پہلے ہی کہا تھا کہ بوجھ بھاری ہے مت اُٹھاؤ۔

اگر اس نے اُٹھا لیا تو کیا ہرج ہوا، گدھا تھا اُٹھا لیتے۔ ایک تو بیچارا گرا، چوٹ

آئی۔ دوسرے اتنا پیٹا کہ وہ مر گیا۔

کانسٹبل نے لالہ جی کو تھانہ چلنے کو کہا۔ اور کلّو کو دوسرے مزدوروں نے اُٹھا لیا۔

رپورٹ درج ہو گئی اور کلّو کو ہسپتال بھیج دیا۔

ہسپتال پہنچ کر کلّو کو ہوش آیا۔

میں کہاں ہوں؟

ہسپتال میں

ماں کہاں ہے؟

سیٹھ گوردھن داس پاس ہی کھڑا تھا۔ پوچھنے لگا کیا حال ہے۔

پولیس انسپکٹر بھی پہنچ گیا۔ کیا بیان ہے تمہارا۔ اس نے تجھے پیٹا تھا۔

مجھے تو کسی نے نہیں مارا صاحب۔ سوٹ کیس بھاری تھا۔ لالہ جی نے منع بھی کیا۔

لیکن پیٹ کھانا مانگتا تھا۔ میں نے اُٹھا لیا۔ ٹانگوں میں اتنی طاقت نہ تھی گر گیا۔

لیکن لوگ کہتے ہیں کہ لالہ نے تجھے مارا ہے

نہیں۔ صاحب میں خود اپنی غلطی سے گرا تھا۔

پولیس انسپکٹر چلا گیا۔ لالہ گوردھن داس کے دِل پر چوٹ لگی اُس نے کلّو اُٹھایا۔

کہاں رہتے ہو کلو؟

اس دنیا میں جہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں اپنے آرام کے لئے دوسروں کے سکھوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ جہاں انسانیت کا خون ہوتا ہے۔ اور لوگ تماشہ دیکھتے ہیں جہاں غریب کی بے بسی سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ جہاں انسان کو بھیڑ بکریوں سے ابتر سمجھا جاتا ہے۔ جہاں لوگ دولت کے نشے میں فاقے مرنے والوں پر ہنستے ہیں۔ اور جہاں غربت کی تصویر ناچتی ہے۔

بس بس کلو میں نے ایک بات پوچھی اور تو نے اپنا کلیجہ چیر دیا۔

ہاں جب کوئی پوچھتا ہے تو اس کو اپنے سینے کے داغ دکھانے ہی پڑتے ہیں۔ لالہ جی ماں باپ تمہارے یہاں ہی مزدوری کرتے ہونگے۔

باپ مر گیا بھیک مانگتے مانگتے۔ اب ماں مر رہی ہے۔ میں بھیک نہیں مانگنا چاہتا اس لئے مزدوری کرتا ہوں۔

لالہ گوردھن داس کلو کو اپنے ساتھ لے گیا اور اپنی مل میں چپراسی رکھ لیا۔ لوگوں نے کلو کی ماں کو بتایا کہ اُس کو چوٹ آئی ہے اور اس کو بیہوشی کی حالت میں ہسپتال میں پولیس لے گئی ہے۔ وہ دھڑام سے گر گئی۔ چل تو وہ بھی سکتی تھی۔ لیکن ماں کی ممتا اُس نے ایک دو ساتھیوں کو ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن ان میں ہمدردی کہاں۔ انھوں نے صاف صاف انکار کر دیا۔ وہ روتی پیٹتی ہسپتال پہنچی۔ لیکن معلوم ہوا کہ کلو یہاں سے چلا گیا ہے۔

کلو رات کو ماں کے پاس آیا۔ اور جب ماں نے سُنا کہ وہ چپراسی ہو گیا ہے اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ماں کو اپنے ساتھ مل میں لے گیا۔

کتنا خوش تھا کلّو۔ جب ایک دِن کار میں بیٹھ کر لالہ جی کے ساتھ بازار گیا تھا۔ اس کے بچپن کے خواب کی تعبیر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

کلّو نے پڑھنا شروع کر دیا۔ جس وقت بِل سے چھٹی ہوتی وہ سیدھا بابو منوہر لال کے گھر چلا جاتا۔ اُس کے گھر کا کام کر دیتا اور بابو منوہر لال سے پڑھ لیتا۔ گھر پر کا وہ رات کے بارہ بارہ بجے تک پڑھتا رہتا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات نے گھر کیا ہوا تھا۔ کہ انسان محنت سے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اور اس کی زندہ مثال اس کے سامنے تھی۔ اکثر وہ دِل میں کہتا کہ یہ جو بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔ کبھی وہ بھی چھوٹے تھے۔ وہ بھی پڑھتے تھے وہ بھی بڑا آدمی ہو سکتا ہے۔ وہ بھی کُرسی پر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ بھی ایک چپراسی سے منیجر ہو سکتا ہے۔

کنگلی بھی وہ کنگلی نہ تھی۔ بلکہ ایک غریب گھرانے کی عورت۔ ہر مانگنے والے کو کچھ نہ کچھ دے دیتی۔ اس نے کبھی کسی کو خالی ہاتھ گھر سے نہ جانے دیا۔ مانگنے والے کی آواز اس کو اپنا گذرا ہوا زمانہ یاد کرا دیتی۔

کلّو بھی اب کلّو نہ تھا۔ بلکہ کلونت رائے چپراسی۔

(۵)

کلونت نے آٹھویں کا امتحان دیا۔ ہر روز کی محنت کا ثمر جو ملنا چاہیئے وہی اس کو ملا۔ وہ پاس ہو گیا۔ اپنے مالک کی خدمت دل و جان سے کرتا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی قسمت کے بنانے میں لالہ جی کا بھی ہاتھ ہے۔

دِن گذر رہے تھے اور کلونت کی قسمت کا ستارہ دِن بدِن روشن ہو رہا تھا۔ بابو منوہر لال سے اب بھی پڑھتا تھا۔ لیکن سکول میں بھی رات کو جاتا۔ آخر ایک سال کے اندر ہی اس نے پرائیویٹ طور پر میٹرک پاس کر لیا۔ میٹرک کا نتیجہ آتے ہی لالہ گوردھن داس نے کلونت

کو دفتر میں کلرکی کی جگہ دے دی اور بھگوا ڑہ بل میں بھیج دیا۔ دوسری جگہ بھیجنے کا راز لالہ ہی جانتے تھے۔

کلونت کی ہر دلعزیزی۔ محنت، دیانتداری فرمانبرداری سے چند ہی مہینوں میں منیجر مہربان ہو گیا۔ اور اس کی تنخواہ میں ترقی کر دی۔

کتنی خوش ہوتی تھی کنتگلی۔ جب وہ اُسے دفتر سے آتا ہوا دیکھتی۔ ایک دن بل میں چھٹی ہو جانے کے بعد کلونت دفتر میں کام کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دھوئیں پر پڑی جو منیجر کے ساتھ والے کمرہ سے آ رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ منیجر کو اطلاع دی۔ منیجر تو فائر بریگیڈ کو ٹیلیفون کرنے لگا۔ اور کلونت پانی کا نل کھول کر آگ کے بجھانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر بتر تھا اور آنکھیں دھوئیں سے بند۔ لیکن پھر بھی وہ آگ بجھانے میں مصروف تھا۔ فائر بریگیڈ ابھی نہ پہنچا تھا۔ کلونت کی جانفشانی سے آگ پر قابو پا لیا گیا۔ منیجر دھرم چند نے کلونت کو باہر نکالا۔ لیکن وہ تو بیہوش تھا۔ چند منٹ بعد کلونت کو ہوش آیا۔

کلونت واقعی تم نے کمال کر دکھایا۔ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تو نے لاکھوں کا نقصان ہونے سے بچا لیا ہے۔

میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ بابو جی۔

کلونت کی کارگزاری کا تذکرہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ جب لالہ گوردھن داس کو منیجر کی چٹھی ملی وہ کس قدر خوش ہوا۔ اس نے پانچسو روپیہ انعام۔ سرٹیفکیٹ اور پچاس روپیہ ماہوار ترقی کا آرڈر بھیجدیا

کلونت کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ جس تیزی سے وہ

سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ ہر ایک کی آنکھوں میں کانٹا بنتا جا رہا تھا۔ پھگوا ڑہ آکر اس نے ایف۔ اے۔ پاس کر لیا۔ اور اُس کو الاؤنس وغیرہ ملا کر دو صد پچاس روپے ماہوار ملتے تھے۔ ماں کنگلی جو کبھی ایک ایک پیسہ کے لئے محتاج تھی اتنا روپیہ دیکھ کر اس کا بڑھاپا جوانی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو جب ماں بیٹے بیٹھتے۔ تو بچپن کے زمانہ کو اکثر یاد کر کے بھگوان کا شکر بجا لاتے۔

مینجر کلونت کی لیاقت شرافت۔ دیانتداری اور شیریں گفتاری کا دلدادہ ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دِن دُور نہیں جب کلونت اسسٹنٹ کی کرسی پر بیٹھ جائیگا مینجر بابو دھرم چند کی لڑکی سرلا نے میٹرک پاس کیا۔ کالج دلانے کا ارادہ تھا لیکن ماتا ساوتری نے کالج بھیجنے سے انکار کر دیا۔

ساوتری کو بخار کی شکایت تھی اور ٹمپریچر زیادہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ نوکر گھر پر نہ تھا سرلا کو ماں نے کہا۔ کہ دفتر سے بابو جی کو بُلا لاؤ۔

سرلا ماں کی حالت دیکھ کر پریشان تھی۔ اُس نے جُوں ہی سڑک کو عبور کرنا چاہا ایک طرف سے بس اور دوسری طرف سے ٹرک آ رہا تھا۔ سرلا دونوں کے بیچ میں پھنس گئی تھی۔ کلونت کی جو کہ بِل کے دروازہ سے باہر نکلا ہی تھا نظر سرلا پر پڑی۔ بھاگا اور بھاگتے بھاگتے سرلا کو دھکا دے دیا۔ سرلا تو سڑک کے دوسری جانب جا گری۔ لیکن کلونت ٹرک کے زد میں آگیا گرا۔ ٹانگوں پر چوٹ آئی۔ سر سے خون نکلا اور بیہوش ہو گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا تھا کہنے لگے:۔

ایک لڑکی کی جان بچائی۔ لیکن خود بچارا زخمی ہو گیا۔

دنیا میں ایسے بھی انسان ہیں جو دوسرے کی زندگی کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں

سرلا نے کلونت کو زخمی دیکھا بھاگی اپنے پتا کو بلانے ۔لیکن وہ تو پہلے ہی آ رہا تھا۔

بابو جی ۔ مجھے بچا لیا لیکن خود مر گیا۔

کون ہے وہ ؟

میں نہیں جانتی کوئی مل کا ہی ہوگا ۔

بابو دھرم چند نے جب کلونت کو زخمی حالت میں دیکھا اُن پر سکتہ طاری ہو گیا۔

مسٹر کلونت ۔

جی بابو جی ۔ وہ لڑکی بچ گئی ؟

ہاں ۔ ہاں بچ گئی ۔ تمہارا کیا حال ہے ۔

میں ٹھیک ہوں بابو جی ۔

ٹرک ڈرائیور کو لوگوں نے پکڑا ہوا تھا۔ کلونت نے جونہی ڈرائیور کو اس حالت میں دیکھا اُس بیچارہ کو چھوڑ دو ۔ میں خود بھاگ کر آیا تھا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں ۔ چھوڑ دو ۔ دیکھو بھائی تم جاؤ ۔ اگر انھوں نے کچھ بھلا بُرا کہا ہو تو مجھے معاف کر دو ۔ ڈرائیور کی آنکھوں سے آنسو آ گئے اور وہ چلا گیا ۔

کلونت چارپائی پر پڑا تھا ۔ زخم گہرا تھا ۔ لیکن پھر بھی اس کو کوئی تکلیف نہ تھی ۔ وہ خوش خوش دکھائی دیتا تھا ۔ اس لیے کہ اس نے انسانی فرض ادا کیا تھا۔

بابو دھرم چند کئی دفعہ کلونت کو دیکھنے آیا اور سرلا بھی ۔ اب وہ کلونت تھا اور نہ ہی وہ بھیک مانگنے والی کنگلی ۔ اس کے گھر کی صفائی ، پاکیزگی دیکھ کر ہر کوئی متاثر ہو جاتا تھا ۔ کلونت نوجوان تھا ۔ حُسن کی بہار اُس پر آئی تھی وہ بھی ایک خوشنما پھول بن گیا تھا ۔ اُس کو اگر کبھی خیال آتا تھا تو بوڑھے باپ رملی کا جس کو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے تھے ۔ سرلا جوں جوں کلونت

کو دیکھتی اپنے آپ کو اس کے نزدیک تر ہی دیکھ پاتی۔

آخر کلونت صحت یاب ہو گیا اور مل میں جانے لگا۔ ایک دن بابو دھرم چند نے بلا کر پوچھا۔

"مسٹر کلونت تم نے ابھی شادی نہیں کی"۔

"بابو جی۔ ابھی تو اس قابل ہوا ہوں کہ گھر کا خرچ بے فکری سے چلا سکوں"۔

"اگر میں اپنی سرلا کو تمہارے لئے منتخب کروں تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

بابو جی۔ میں اور سرلا ——!

"ہاں۔ ہاں۔ اس میں ہرج بھی کیا ہے"۔

"لیکن بابو جی ——!!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آج ہی تمہاری ماں سے بات پکی کرونگا مجھے تمہارے جیسا ہی داماد چاہیئے"۔

کلونت خیالات میں ایسا غرق ہوا کہ اُس کو تن بدن کی سُدھ نہ رہی۔ مل میں چھٹی ہو گئی لیکن وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اگر چپراسی وہاں نہ آجاتا تو نہ جانے وہ کتنی دیر اسی حالت میں وہاں بیٹھا رہتا۔

دفتر سے نکلکر گھر کی طرف جا رہا تھا کہ سرلا راستہ میں مل گئی۔

"ابھی دفتر سے آرہے ہیں۔ آپ؟"

"جی ہاں"۔

"اگر آپ اس دن دھکا نہ دیتے تو میں آج دوسری دُنیا میں ہوتی"۔

"جس کو بھگوان رکھے اس کو کوئی نہیں مار سکتا۔ سرلا رانی"۔

میری زندگی تو آپ کی بدولت ہے۔ یہ میں تمام عمر نہیں بھول سکتی۔

"کیا کہہ رہی ہو سرلا۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا۔ آپ پر کوئی احسان نہیں کیا"۔

"آپ کچھ بھی کہیں مسٹر کلونت۔ لیکن میرے دل سے پوچھئے وہ کیا کہتا ہے"۔

"اچھا۔ مجھے اجازت دیجئے دیر ہو رہی ہے"۔

"نمستے"۔

کلونت کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بابو دھرم چند ان کے گھر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے کنگلی سے بات کی وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ کیا جواب دے ہاں کہے یا نہ۔ صرف اتنا کہا کہ بابو جی آپ سمجھدار ہیں جس طرح مناسب سمجھیں کریں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں۔

دھرم چند نے گھر پہنچکر رام پیاری کو یہ خوش خبری سُنائی کہ کلونت کی ماں نے یہ رشتہ منظور کر لیا ہے۔ سرلا نے جب سُنا اس کی دلی تمنا بر آئی تھی دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"آخر وہ میری زندگی کے ساتھی ہو ہی گئے۔ مجھے زندگی دینے والے"۔

کلونت گھر پہنچا۔ دروازہ پر بچپن کا ساتھی چچازاد بھائی رلدو بھکاری کھڑا تھا وہ بھی بھگوا ڑہ آگیا تھا دہلی چھوڑ کر اور بھیک مانگتے مانگتے کلونت کے گھر پہنچا۔ کنگلی کٹوری میں آٹا ڈالے دینے آرہی تھی ادھر کلونت خیالات میں کھویا ہوا تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا جونہی اُس کی نظر رلدو پر پڑی اور اس نے کلّو کنگلی چاچی کو دیکھا۔

"کلّو تم۔ چاچی تم"۔

"آؤ بیٹا رلدو۔ آؤ۔ تم دہلی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے"۔

چاچی۔ بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں بھی ایسی ہی حالت رہی۔ پھر ہردوار آگیا۔ مگر وہاں بھی مانگنے والے لاکھوں تھے۔ ہزار ڈھونگ رچا کر پیٹ پالنے کو دو وقت مشکل سے کھانا

ملتا تھا۔ وہاں سے یہاں کے ایک بھکاری کے ساتھ آگیا۔

بہت اچھا کیا رلدو۔ چلو اندر چلو بٹیا۔ اب تمہیں بھیک نہیں مانگنی پڑے گی۔

کلّو نے رلدو کو گلے لگا لیا۔ اور اندر لے گیا۔ کلونت نے کپڑے دیئے اور خوشی خوشی کھانا کھلایا۔

"کلّو میں نہیں سمجھا کہ تم یہ بابو کس طرح بن گئے"۔

کلّو ہنس پڑا۔ محنت کرنے سے اپنے آپ پر وشواش کرنے سے اور انسانی فرض بجا لانے سے۔

"میں بھی تو صبح سے شام تک محنت کرتا ہوں کوئی گھر ایسا نہیں ہوتا جہاں جا کر آواز نہ لگائی ہو۔ لیکن شام کو وہی چار روٹی کا آٹا"۔

"یہ مانگنے کا کام چھوڑ دو بھیا۔ تمہیں نوکر کرا دوں گا"۔

"نوکری دو کری تو مجھ سے ہوتی نہیں۔ باپ نے نوکری نہیں کی دادا نے نہیں کی۔ میں خاندانی کام کیسے چھوڑ سکتا ہوں"۔

"مجھے دیکھ کر بھی تمہیں رشک نہیں آتا رلدو"۔

"رشک کیا؟ قسمت ہے تمہاری"۔

قسمت بھی تو انسان خود بناتا ہے۔ اچھے اعمالوں سے تم یہاں رہو۔ کھانا کپڑا ملتا رہے گا بھیک مت مانگو۔

کھانا کپڑا مل جائے تو اور کیا چاہیئے کلّو۔

ہاں ہاں سب کچھ ملے گا۔ لیکن بھیک نہیں مانگنی ہوگی۔

نہیں مانگوں گا۔

کھانا کھانے کے بعد کنگلی نے کہا۔

"بیٹا! آج بابو دھرم چند جی آئے تھے وہ شادی کے لئے کہہ رہے تھے"۔

"تو تم نے کیا کہا ماں"۔

"میں نے کہا آپ سمجھدار ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ ہم اِس قابل نہیں"۔

"کلو یہ بابو دھرم چند کون ہیں"؟

"مل کے منیجر ہیں۔ بہت شریف اور خاندانی ہیں"۔

اچھا تو میرے کلو کی شادی ایک اونچے گھرانے میں ہو رہی ہے پھر تو ہم بڑے آدمی ہو جائینگے۔

بڑے چھوٹے کا سوال ہی کیا ہے بھیّا پیسہ ہے تو سب کچھ ہے پیسہ پاس نہیں ہیں تو کچھ بھی نہیں۔

سرلا اور کلونت کی محبّت کا پودہ دن بدن بڑھ رہا تھا دونوں برابر ہیں ہر روز ملتے اور سنہری دُنیا کا خواب لیتے۔

چند دنوں کے بعد بابو دھرم چند نے شگن کی رسم ادا کر دی۔ کافی خرچ کیا انہوں نے کس قدر خوش تھے۔ کلونت اور کنگلی۔ لیکن رلدو کے چہرے پر خوشی کے آثار نہ تھے سگائی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ بابو دھرم چند نے پوچھا اور کوئی رشتہ دار ہو تو بتائیے۔

یہ میرے دیور کا لڑکا رلدو رام ہے۔ چنانچہ اس کو بھی دس روپے دیئے گئے۔

ایک دن سرلا اور کلونت کار میں جا رہے تھے کہ رلدو راستہ میں نظر پڑا۔ کلونت نے کار کھڑی کر دی۔

"کہاں جا رہے ہو بھیّا؟ مجھے بھی ذرا اسٹیشن پر چھوڑ جانا"۔

"چلو۔ پر وہاں"

"ہاں میرے ایک دوست نے وہاں آنا ہے"۔

کلونت نے کار میں بٹھالیا۔ رلدو زندگی میں پہلی بار کار میں سوار ہوا تھا۔ اور جب اس نے سرلا کو دیکھا تو وہ اپنے آپ کو بھول گیا۔

سرلا نے کہا۔

بمبئی میں تو ان کا کام بہت اچھا ہو گا۔ یہاں بھی ایک مل جاری کر لیں۔

مل۔ ہاں۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اب دونوں بھائی یہاں ہی اکٹھے رہیں۔

اتنے میں سٹیشن آگیا اور رلدو اُتر گیا۔

"بہت ہی شریف ہے آپ کا بھائی"۔

"میں کیا کوئی چور ہوں سرلا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ ایک سادہ لڑکی کو پھنسا لیا۔ اُس کی آنکھوں کی نیند چھین لی۔ اس کے دل کا چین لے لیا۔ اور کہتے ہیں کہ میں کوئی چور ہوں"۔

واپسی پر جونہی کار سٹیشن پر کھڑی ہوئی ایک آواز آئی۔ کچھ دے دو بابا؟

کلونت نے آٹھ آنے نکالے اور دیدیئے۔ کلونت نے بھکاری کی چال دیکھی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے رلدو ہے لیکن دل کو یقین نہ آیا۔

آپ بھکاریوں کو خوب دیتے ہیں؟

ہاں سرلا جس نے غریبی کے دن دیکھے ہوں وہ غربت سے ہمیشہ ڈرتا ہے۔

اب ڈرکاہے کا اسسٹنٹ منیجر تو آپ ہو گئے شادی سے پہلے پہلے منیجر بھی ہو جائینگے۔

پتاجی کہتے ہیں۔ کہ مالک اور ایک ہل چلانے والے ہیں"

"تو آپ کو سب باتیں پہلے ہی معلوم ہو جایا کرتی ہیں سرلا؟"

"کیوں نہیں مجھے خیال جو ہر وقت آپ کا ہی رہتا ہے"۔

کلونت گھر پہنچا۔ رلدو ابھی تک نہ آیا تھا۔ رات کے دس بجے رلدو گھر پہنچا۔ کلونت نے اس کے انتظار میں کھانا بھی نہ کھایا تھا۔

"ماں کھانا لاؤ۔ رلدو بھیّا آ گئے۔ آج تم نے دیر لگادی۔ مجھے بھوک نے تنگ کیا ہوا تھا"

"تم نے میرا انتظار کیوں کیا۔ کھا لیتے"

"ایسا نہ کہو بھیّا۔ مدّت کے بعد تو بھائی بھائی اکٹھے ہوئے ہیں۔ اب تو میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں گا"۔

"وہ کار میں کون تھی کلّو؟"

"میری جیون۔ ساتھی۔ اور تیری بھابی"۔

رلدو نے جس دن سے کلونت کی عزّت۔ آبرو۔ دولت۔ شان و شوکت دیکھی تھی اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ آج سرلا کو دیکھ کر اس کے اندر ایک طوفان پیدا ہو گیا۔ وہ طرح طرح کی ترکیبیں سوچنے لگا کہ کس طرح کلونت کی عزّت و آبرو مٹی میں ملا سکتا ہے۔ رلدو کو کپڑا۔ کھانا تو مفت ملتا تھا اور جیب خرچ کے لیے بھی چاچی کنگلی سے مل جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی کلونت سے پانچ دس روپے لے لیتا۔ اور اسی پر اکتفا کرتا تو بات تھی۔ جونہی شام کے چھ بجے کا ٹائم ہوتا وہ سٹیشن پر چلا جاتا اور اپنا لباس تبدیل کر کے بھیک مانگتا۔ سکھ آرام نصیب ہوتے ہوئے بھی وہ بھیک مانگنا اپنا اولاً فرض سمجھتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اسکی محبّت چھنکو کی لڑکی سے تھی۔ وہ بھی بھکارن تھی۔ اور ہو سکتا ہے کہ رلدو

اس کی خاطر بھیک مانگتا ہو۔ اور جو بھی اکٹھا کرتا وہ پھنکو کو دیتا ہو۔ اس لئے کہ پھنکو کی شادی اس سے ہو جائے۔ لیکن جھمکو کو رلدو ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ وہ کہتی۔ کہ نوجوان تندرست ہے۔ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا۔ وہ بھی بھیک مانگتی ہے صرف ماں باپ کے مجبور کرنے پر اور وہ بھی چند گھنٹے۔ اگر کچھ مل گیا۔ ورنہ خالی ہاتھ اپنے ٹھکانے آجاتی۔ اور کھانا وغیرہ پکانے میں مصروف رہتی

رلدو نے ایک دن جھمکو سے کہا کہ شادی کی بات پکی کر لو۔ اب تو میں کافی پیسے کما لاتا ہوں

کیا کما لاتے ہو۔ اتنا تو میں نے ایک سال میں جھمکو کھلایا ہوگا۔ اب وہ سولہ سال کی ہو گئی ہے بغیر کھلائے پلائے تھوڑے ہی اتنی بڑی ہوئی ہے۔ پہلے وہ خرچہ تو دے جو ہم نے اس پر خرچ کیا ہے۔ پھر بات کرنا۔

میں تو اب ساری عمر ہی آپ کے یہاں رہوں گا جو کچھ لایا کروں گا آپکو ہی دیا کروں گا پہلے کما کر تو دکھاؤ۔ دوسرے جھمکو کو پوچھ لوں۔

بل میں چھپی بیٹھی۔ کلونت امرت سر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اتنے میں سرلا آگئی۔

"کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"امرت سکلور گیا نہ مندر دیکھنے کی مدت سے خواہش تھی۔

"اکیلے ہی جا رہے ہیں آپ؟

"نہیں تو۔

"اور کون جا رہا ہے ساتھ؟"

"سرلا رانی ۔ ا"

"ہاں۔ ہاں سرلا۔ تم بھی بھگوان کے درشن کر آؤ۔ کنگلی نے کہا۔"

"ماں کو تو بتا آؤں ماتا جی۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ کار بھی تو پتا جی سے لینی ہے۔"

"اچھا جی۔ کار بھی ہماری اور پٹرول بھی ہمارا۔ اور بغیر اطلاع تیاری ہو رہی ہے۔"

"اطلاع دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنا گھر ہے اپنی کار ہے۔"

سرلا ہنس دی۔ ٹفن باکس دے کر ماں نے کہا۔

بیٹا! میری طرف سے بھگوان کے چرنوں میں نمسکار کرنا اور پرارتھنا کرنا کہ اسی طرح دیا درشٹی رکھنا۔ بھگوان بھکاری کی جھولی کبھی خالی نہ رکھنا۔

میں کوئی بھگوان سے مانگنے جا رہا ہوں ماں۔ میں تو شردھا کے پھول چڑھانے جا رہا ہوں۔ بھکاری بن کر نہیں ماں بھکاری۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے بچپن کا تصور گھومنے لگا اور سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ماں دوڑتی ہوئی آئی۔ بیٹا! مجھ سے غلطی ہوئی۔ کبھی نہیں کہوں گی۔ نہیں کہونگی بیٹا۔ اٹھو۔ جاؤ۔

سرلا حیران تھی یہ ماجرہ کیا ہے۔

ماں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ اتنا کٹھور نہیں ہونا چاہیئے۔

کلونت اب سنبھلا۔ کچھ نہیں سرلا۔ خیالات نے فتور مچایا اور نا معلوم میں کیا کیا بک گیا تو اٹھو چلو، دیر ہو رہی ہے۔ شام کو واپس بھی آنا ہے۔

دونوں بابو دھرم چند کے پاس پہنچے۔

کہاں کی تیاری ہے کلونت بابو۔

امرت سر جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔

ضرور۔ ضرور جائیے۔ چھٹی ہے۔ سیر کر آئیے۔

سیر کے لئے تو جا رہے ہیں اور ساتھ ہی بھگوان کے درشن کر آئینگے۔

تو سرلا بھی جا رہی ہے۔

آپ اگر اجازت دیں۔ تو

تم تو دونوں تیار ہو کر آئے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر آپ اجازت دیں۔

دونوں شرمندہ ہو گئے۔

سر کیوں نیچا کر لیا ہے۔ جاؤ گے نہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔ یہ لو پچیس روپیہ۔

کچھ تو پاپڑ وڑیاں لے آنا اور باقی جیب خرچ رکھ لینا۔

کلونت اور سرلا، امرت سر پہنچے۔ درگیانہ مندر کی شان دیکھی۔ دل کو شانتی ملی۔ بھگوان کے درشن کئے۔ کلونت نے پیار تھنا کی۔

تمہارے دربار میں کسی چیز کی کمی نہیں بھگوان مجھے شیر باد دو۔ کہ میں اپنا فرض کبھی نہ بھولوں۔ اور دوسرے سرلا کی ہر خوشی غمی میں شریک رہوں میری بھی ایک عرض سن لینا بھگوان جب تک جیتی رہوں اپنے سوامی کے چرنوں کی داسی رہوں۔ بھکارن کی جھولی بھر دینا ہے۔ یہ کبھی خالی نہ ہو۔

سرلا۔ اب تو موت ہی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے۔

میں تو موت سے بھی لڑ دوں گی۔ اگر اس نے مجھے پہلے نہ بلا لیا۔

وہ مندر سے باہر آئے۔ ہزاروں بھکاری اپنا اپنا کاسہ لئے کھڑے تھے۔ بابو ایک

پیسہ بھگوان کے نام پہ۔ چاروں طرف سے مانگنے والوں کی بھیڑ دیکھ کر کلونت کانپ گیا اُس نے پہلے ہی دس روپے کے پیسے ٹکے پاس رکھ لئے تھے۔ جیب سے نکال کر پھینک دیئے یہ لو۔ یہ لو۔ آواز نہ نکالو۔

بھکاری چیل کی طرح اُن پہ جھپٹے۔ اُس میں اُن کی لڑائی بھی ہوئی۔ گالی گلوچ بھی ہوا۔ کلونت کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اِس سے نہ رہا گیا کہنے لگا۔ بھائیو! اس میں شک نہیں کہ بغیر محنت مشقت کئے بیٹھے بیٹھے صرف اتنی زبان چلانے سے "بھگوان کے نام پر کچھ دیدو"۔ آپ کو مل جاتا ہے جس سے تم پیٹ پالتے ہو۔ تم میں سے کوئی ایک یا دو اپاہج ہوں گے۔ باقی سب کام کر سکتے ہیں۔ پھر کیوں کام نہیں کرتے۔ اِن صفت کے پیسوں میں نہ تو خوشی ہے اور نہ ہی عزت۔ نہ سکھ کا سانس ہے اور نہ ہی شانتی۔ میری طرف دیکھو میں بھی بھکاری ہوں۔ لیکن آپ مجھے بھکاری نہیں کہتے۔ کیوں۔ میں نے اپنے فرض کو پہچانا ہے۔ اور آپ اپنے فرض کو بھول چکے ہیں۔ اتنی لمبی چوڑی دُنیا پڑی ہے محنت مزدوری کرنے کا موقعہ ہے۔ ہر طرف سرکار نے نئے نئے کام شروع کئے ہوئے ہیں۔ مزدور نہیں ملتے۔ لیکن ایک تم ہو جو تمام دن بیٹھے بیٹھے گذار دیتے ہو۔ ہر ایک آنے جانے والے کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ اور ان میں کوئی ایک ہوتا ہے جو آپ کو کچھ دے دیتا ہے۔ ورنہ حقارت کی نظر سے دیکھ کر آپ چلا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھو۔ اپنے ملک کو دیکھو جو ترقی کی طرف دن رات بھاگا جا رہا ہے۔ لیکن تم اس کے راستہ میں ایک چٹان بن کر رکاوٹ پیدا کر رہے ہو۔ اپنے لئے نہ سہی اپنی ہونے والی اولاد کا خیال کرو۔ اس ملک کو بھکاری مت بناؤ۔ مت بناؤ میرے بھائیو! اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جا بابو جا بہت نصیحت سُنی۔ بچپن سے یہ نصیحت سُنتے سُنتے کان بہرے ہو گئے

ہیں۔ اگر تم بھی ہماری طرح ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا۔ کہ مانگنا کتنا مشکل ہے۔

میں بھی تمہاری طرح بھکاری ہوں۔ مانگنا بہت مشکل ہے۔ کسی نے جھوٹ نہیں کہا۔ "مانگن سے مرنا بھلا۔ مت کوئی مانگے بھیک"۔ لیکن پھر تم مانگتے ہو۔

ایک بوڑھا آگے آیا۔ بابو تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جب مزدوری نہیں ملتی۔ رات کو بچے بھوک سے بلبلاتے ہیں۔ دولت کے رکھوالے پاس سے گذر جاتے ہیں۔ لیکن غریب کی آہ وزاری پر اُن کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی بھوکا مر جائے اُن کے دِل پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ غریب کیا کرے۔ بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگنے کے سوائے اور چارہ بھی کیا ہے۔

یہی تو سمجھ کا پھیر ہے بابا۔ جس بھگوان نے جنم دیا ہے اُس نے کھانے کا پہلے ہی انتظام کیا ہوا ہے۔ صرف اعتقاد ہے۔ انسان کی آزمائش دکھوں میں ہوتی ہے۔ جو دکھوں کا مقابلہ کرتا ہے وہ کبھی دُکھ نہیں اُٹھاتا۔

یہ بات ہے تو تم ہی ہمیں کوئی مزدوری دو۔ ہم کبھی بھیک نہیں مانگینگے۔ نصیحت کرنا آسان ہے۔ لیکن دوسروں کی امداد کرنا مشکل ہے بابو۔

مجھے کیوں کہتے ہو بابا۔ بھگوان آپ کے سامنے رہتے ہیں۔ سچے دل سے پرارتھنا کرو پھر دیکھو کام ملتا ہے یا کہ نہیں۔

چلو بھی نا دیر ہو رہی ہے۔ آپ نے تو جہاں بھکاری دیکھے بس لیکچر شروع کر دیا۔

ہاں سرلا۔ میرا دل بھکاری کا نام سُنکر کانپنے لگ جاتا ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے مُلک میں ایک بھی بھکاری نظر آئے۔

لیکن آپ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ تو اپنی عادت سے مجبور ہیں۔

اس عادت نے تو برباد کیا ہے۔

(۵)

رلدو جب گھر آیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ کلونت اور سرلا امرت سر گئے ہیں وہ سیدھا بابو دھرم چند کے مکان پر پہنچا۔

نمستے بابو جی۔

نمستے۔ تم بھائی کے ساتھ امرت سر نہیں گئے۔

میں گھر پر نہیں تھا۔

کس طرح آنا ہوا؟

ایک ضروری بات کرنی تھی۔ میں نے سوچا۔ آج آپ کو چھٹی ہوگی کہہ دوں۔

ہاں۔ ہاں بتائیے۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ جس کلونت کے ساتھ آپ اپنی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں وہ ایک بھکاری کا بیٹا ہے اور نیچ جاتی سے تعلق رکھتا ہے اور میں بھی اُسی کا بھائی ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو شام کو کسی وقت سٹیشن پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔

تو کلونت کھتری نہیں؟

نہیں بابو جی۔ نہیں۔ آپ اس سے ذات تو پوچھ لیجئے۔ اچھا میں چلا۔ نمستے۔

بابو دھرم چند کی کمر ٹوٹ گئی۔ آنکھوں سے شعلے نکلے اور چہرہ غصے سے لال ہو گیا مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ دھوکا۔ میں کبھی بھی اپنی لڑکی کی شادی ایک کمینے بھکاری خاندان میں نہ کروں گا۔

(۶)

سرلا اور کلونت خوشی خوشی گھر پہنچے۔ پاپڑ اور وڑیاں جو امرت سر سے لائے تھے لیکر
جب سرلا اندر داخل ہوئی۔ بابو دھرم چند نے کہا۔
کلونت کو دے دو وہ اپنے گھر لے جائے۔
آپ تو خوشی سے کھایا کرتے ہیں پتا جی۔
ہاں۔ ہاں کھایا کرتا ہوں لیکن میں نے تجھے کہا ہے کلونت کو دے دو۔
کلونت حیران تھا کہ اس قدر تبدیلی کیوں آگئی۔ بابو دھرم چند کبھی اس طرح برخی
سے پیش نہ آئے تھے۔ آج کیا ہو گیا ان کو۔ لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ چپکے سے الٹے
پاؤں گھر آگیا۔ سرلا کو بھی اپنے پتا کے برتاؤ سے رنج پہنچا لیکن وہ خاموش اندر چلی گئی
ماں خاموش چارپائی پر بیٹھی تھی۔
آج کیا ہوا ماں۔ تم سب غصے میں ہو۔
کچھ نہیں۔ آج سے تم کلونت سے ملنا جلنا بند کر دو سرلا۔
یہ کیوں ماں! میری تو سگائی اُن سے ہو چکی ہے اور چند دنوں بعد اُن کے گھر چلی
جاؤں گی اور تم کہتی ہو۔ کہ ملنا جلنا۔ بات کرنا چھوڑ دوں۔
ہاں ہاں۔ تمہارا کوئی واسطہ کلونت سے نہیں۔ وہ ہماری برادری کا نہیں۔ ہماری
ذات کا نہیں۔ ہمیں دھوکا ہوا ہے۔
سچ سچ بتاؤ ماں بات کیا ہے؟
سچ بتاؤں۔ کلونت ایک نیچ جاتی کا بھکاری ہے۔ کوئی چھوٹا نہ تھا اس کو برادری
ہمیں کیا کہے گی۔ کہ لڑکی کے لئے اپنے خاندان میں کوئی لڑکا نہ تھا جو ایک بھکاری کے گھر
لڑکی دے دی۔ میں تو اب بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ہمارا دھرم بھرشٹ ہو گیا

بس ماں اتنی سی بات پر پتاجی اور آپ غصّے ہیں۔

یہ کوئی معمولی بات ہے؟

معمولی نہیں تو اور کیا۔ جو کچھ تم کہو گی کروں گی۔ اُٹھو کھانا تو کھا لو۔

تو تُم واقعی کلونت سے پریم نہیں کرو گی؟

تُم اُٹھو تو سہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

(۵)

کلونت گھر پہنچا۔ ماں انتظار کر رہی تھی۔ کھانا کھا لو بیٹا؟

ماں بھوک نہیں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ رلدو نہیں آیا؟

صبح کھانا کھا کر دوپہر کو گیا تھا۔ ابھی نہیں آیا۔

میں سونے چلا ہوں آئے تو کھانا کھلا دینا۔

میں اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم سو جاؤ۔

رلدو رات کے گیارہ بجے تک بھی واپس نہ آیا۔

(۶)

دوسرے دن کلونت دفتر گیا۔ بابو دھرم چند کا برتاؤ پہلے جیسا نہ تھا۔ کلونت شام کو گھر پہنچا۔ رلدو کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ صبح سے بھی نہیں آیا وہ رلدو کی تلاش میں سٹیشن پر پہنچا۔ اِدھر اُدھر دیکھا دکھائی نہ دیا۔ اتنے میں بابو دھرم چند کو دیکھا ایک بھکاری سے باتیں کرتے ہوئے وہ بھی وہاں پہنچا۔ رلدو کو بھکاری کے لباس میں دیکھ کر کلونت کے ہوش اُڑ گئے۔

"رلدو تم ——؟"

ہاں کلو۔ کیا اپنا جدّی کام چھوڑ دوں۔ تم نے تو چھوڑ دیا۔ کیا تیرے گھر نوکر بن کر رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا بابا۔ جاؤ اپنا گھر سنبھالو۔

کلونت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کلونت بابو مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ تُو ایک بھکاری کی اولاد ہے مجھے کیوں برباد کیا۔ بھلا ہو رلدو کا جس نے وقت پر بتا دیا۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

ٹھیک ہے بابو جی میں بھکاری خاندان سے ہوں۔ میرے دادا پردادا بھیک مانگتے تھے۔ لیکن میں نے بھیک نہیں مانگی۔ میں نے محنت کی۔ مشقت کی۔ تکلیف اٹھائی رات رات بھر نہیں سویا۔ بھوکا رہا لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ میں نے آپکی عزّت برباد نہیں کی۔ میں خود ہی اس قابل نہ تھا۔ لیکن آپ نے مجھے عزّت دی۔ آپ کے دل کو دُکھ پہنچا ہے۔ اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتا ہوں۔ کہ اب میں یہاں سے جلد ہی چلا جاؤں گا۔ آپ کے سامنے رہ کر دُکھ کا کارن نہ بنوں گا۔

ٹھیک ہے۔ تمہارا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔

وہ سوچتا رہا ـــ سوچتا رہ گیا ـــ بہت دیر تک ـــ یوں ہی زندگی فریب دیتی ہے۔ اور باہر سڑک پر ایک بے فکر بھکاری بار بار پُرسوز لَے میں یہ شعر پڑھ رہا تھا

مائلِ لُطف نہ ہو درد کے دینے والے
مل گیا مجھ کو تو جو کچھ میری تقدیر میں تھا

مدھر ملن

میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتا تم لاکھ بار کہو میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ دھوکا نہیں کھا سکتیں۔

آپ کو دھوکا ہوا ہے ناتھ۔ سُرنیدر آیا تھا اپنی بہن کامنی کا پتہ پُوچھنے چار دن سے وہ گھر نہیں آئی۔

تو یہ کوئی پولیس سٹیشن ہے جہاں گھر سے بھاگ جانے والے کا پتہ درج ہوتا ہے۔

نہیں نہیں مہیش آپ کے پاس آیا کرتا ہے۔ وہ بھی چار دن سے غائب ہے اُس کے متعلق بھی پوچھ رہا تھا۔ مجھ سے پوچھتا، مجھے تو دیکھ کر رفو چکر ہو گیا اور تم کہتی ہو کہ وہ پوچھنے آیا تھا رمیش کو۔ لتا میں اندھا نہیں۔ تمہاری ہر ایک حرکت تمہارے دل کی تصویر پیش کرتی ہے۔ تمہارا اب اس گھر میں گزارہ نہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی یہاں سے چلی جاؤ۔

کہاں چلی جاؤں میرے ناتھ۔ ماں باپ کو منہ نہیں دکھا سکتی اور کوئی ٹھکانہ نہیں

دُنیا میں آپ کے سوا میرا ہے بھی کون۔

ہے بھی کون سُریندر ہے۔ مہندر ہے اور نہ جانے کون کون ہے۔ میں نے تو اِتنے دن صبر سے کام لیا۔ اِس خیال سے کہ تم خود سنبھل جاؤ گی تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میرے والدین سخت ناراض ہیں میں اُنکو منہ نہیں دکھا سکتا۔ لاکھوں کی جائیداد سے محروم ہو رہا ہوں۔

جب میں آپ کے پاس آئی تھی میرے والدین بھی ناراض تھے اس کی سزا اس وقت تک مِل رہی ہے۔ میں دو سال سے ماں باپ کو اپنا منہ نہیں دکھا سکی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آپ دولت کے پُجاری ہیں۔ آپ کی محبت ایک دھوکہ ہے میں کبھی اپنی زندگی آپ سے وابستہ نہ کرتی۔ آپ میری بے بسی کا فائدہ نہ اُٹھائیں۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ اوّل تو میں بے قصور ہوں۔ اگر بھولے سے بھی کبھی کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے۔

معاف کر دوں۔ کیا تُو چاہتی ہے کہ میں اپنی قسمت مٹی میں مِلا دوں۔ باپ چند دنوں کے مہمان ہیں۔ اگر میں جیتے جی اُن کے پاس نہ گیا تو تمام جائیداد مدن موہن کے نام کر دینگے بس مِل کا مالک میں نہیں وہ ہو گا اور میں ایک بھکاری بن کر تیرے ناز نخرے اُٹھاتا رہوں گا۔

لتا نے ایک بار مکان کی چار دیواری پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور بجلی کی طرح دروازہ سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر آئی۔ سوچنے لگی جائے تو کہاں۔ ماں باپ کے دروازے اس کے لئے بند ہیں۔ رشتہ دار کوئی ایسا نہیں جو چند دن بھی آسرا دے سکے۔ سماج بھی ٹھکرائی ہوئی کو سہارا دینے کیلئے تیار نہیں۔ پھر نوجوان ہوں۔ خوبصورت ہوں۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ دِل نے ایک بار کہا واپس چلی جاؤ۔ اُن کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگ لو مگر ضمیر نے آواز دی۔ لتا۔ کیوں پاگل بنتی ہو۔ دولت کے کیڑے کے سامنے کیوں گڑگڑاتی ہو۔ ہمت کرو اور آگے بڑھو۔ لتا چل دی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں اور کس طرف

جارہی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور ایک بپھری شیرنی کی طرح قدم خود بخود اُٹھ رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک معمولی سا سُوٹ کیس تھا جس میں چند کپڑے تھے۔ اُس کے قدم ایک دم رُک گئے۔ جب اُس کے کانوں میں آواز آئی۔

"نتا۔ نتا۔ نتا نے جونہی سامنے دیکھا کار میں کانتا تھی۔

کہاں جارہی ہے نتا"

"جہنم میں"۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ آؤ کار میں بیٹھو۔ ٹھنڈا پانی منگواؤں"۔

"نہیں کانتا مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ ان شعلوں پر ٹھنڈا پانی تیل کا کام کرے گا"۔

"آخر بات کیا ہے۔ دو سال میں تو تیرا نقشہ ہی بدل گیا"۔

"تم نے تو شادی نہیں کی۔"

"نہیں تو۔"

"کانتا۔ مجھے چند دن اپنے گھر میں ٹھکانہ دے سکتی ہو"۔

"کیوں نہیں۔ چند دن کیا عمر بھر رہو"۔

"اچھا تو چلو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ تمہارے ساتھ رہنے سے ممکن ہے غم غلط ہو جائے"۔

"افسوس تو یہ ہے کہ تُو بتاتی کچھ ہے ہی نہیں"۔

بتادوں گی۔ سب کچھ بتادوں گی۔ مجھے چند دن ٹھکانہ چاہیئے پھر میں سب کچھ بتادونگی

(۱۰)

نتا اب کانتا کی مہمان تھی۔ بچپن کی ساتھی ہمجولی اور رازداں گھر پہنچ کر کانتا نے

چائے منگوائی۔

"اچھا اب بتاؤ۔ نتا۔ تجھے کیا ہوگیا ہے"۔

"ہوگیا ہے یہ نا پوچھ کانتا۔ بلکہ اب کروگی کیا یہ پوچھ"۔

نتا نے چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔ ہاتھ اُس کے اب بھی کانپ رہے تھے آنکھوں میں غصّے کے شعلے نکل رہے تھے۔ پیالہ کو میز پر رکھتے ہوئے نتا نے کنول کی بدسلوکی اور بے وفائی کی تمام داستان بیان کردی۔

(٭)

نتا گھر سے چلی گئی۔ کنول چند گھنٹے خیالات میں غرق رہا۔ جونہی گھڑی نے رات کے دس بجائے وہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر تھا۔ کنول نے فسٹ کلاس کے ڈبہ میں اپنا سامان رکھوایا اور خود پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔

کانتا کی نظر کنول پر پڑی۔

"کنول تم یہاں ——!"

"ہاں گھر جا رہا ہوں"۔

"نتا کہاں ہے۔ سُنا تھا اُس نے شادی کرلی ہے"۔

کی تھی۔ لیکن اُس کے طور طریقے اچھے نہ تھے۔ نکال دیا اُسے میں نے"

کنول تم نے اچھا نہیں کیا۔ ایک معصوم کی زندگی برباد کردی اب بھی وقت ہے اُس کو واپس لے آؤ"۔

"واپس لے آؤں۔ کانتا یہ کیسے ہوسکتا ہے"۔

اتنے میں گاڑی نے وِسل دی اور آہستہ آہستہ سیٹی بجاتی چل پڑی۔

(٭)

کا نتا گھر پہنچی۔ لتا گھر پر نہ تھی۔ نوکر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صبح ہی آپ کے جانے کے بعد وہ بھی چلی گئی تھی۔

لتا گھر سے نکلی مکان کی تلاش میں تا کہ کوئی ٹھکانہ بنالے۔ ہوس پرستوں کی برائیوں کو طشت از بام کرنے کے لئے اسٹری نکیتن کھول دے۔ وہ سینما کے پاس سے گذر رہی تھی کہ ایک خوش پوش نوجوان کو ایک حسین تتلی کے پیچھے پیچھے جاتے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنا وہ حسین زمانہ چکر لگانے لگا۔ جب کنول کئی کئی دن اُس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ لتا اُن کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن نوجوان اپنی لگن میں مست دُنیا اور مافیا کو بھولے ہوئے جا رہا تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ اُس کے ساتھ بھی کوئی چل رہا ہے۔ چند قدم تیز چلنے کے بعد حسینہ کے قریب پہنچا اور کہنے لگا

"مرنے والے کو تو ایک نظر دیکھ لیتے"۔ اُس حسینہ نے کوئی جواب دیا۔ لیکن اس کی نزاکت میں نمایاں فرق ضرور تھا۔ لتا دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی کہ یہ بھی کوئی بدنصیب لڑکی ہے۔ اتنے میں کانوں میں آواز آئی۔ میری جان اب تو ترس کھاؤ۔ ساری رات جاگتے گذر جاتی ہے۔ لڑکی نے پھر بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ صرف اتنا کہا۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ ایک بار نہیں کئی بار کہہ چکی ہوں میرا پیچھا چھوڑ دو۔

لڑکی نے مڑ کر پیچھے جونہی دیکھا اس کی نظر لتا پر پڑی وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے بھی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ اُس نے قدم تیز کر دیئے۔

"کیا آپ کو اس لڑکی سے محبت ہے۔؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر کیوں پیچھا کرتے ہو"۔

"وقت گذارنے کے لیے"۔

"لیکن میں تو محبت کرتی ہوں اس لیے آپ کا پیچھا کر رہی ہوں"۔

"سچ سچ"

"سچ نہیں تو جھوٹ۔ کنول کی پانچھیں کھل گئیں۔ میں نے تو آپکو پہلی بار دیکھا ہے۔

"میں تو ہر روز ہر گھڑی آپ کو ہی دیکھا کرتی ہوں۔ میں نے تو کئی بار کوشش کی لیکن موقعہ نہ مل سکا ——— اگر آج بھی آپ کی یہ حرکت نہ دیکھتی تو کبھی اپنے دل کا راز آپ سے نہ کہتی"۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں"۔

"کیوں نہیں۔ مجھے اُرملا پکارتے ہیں"۔

"مجھے بھی اجازت ہے۔ آپ کا نام اور پتہ پوچھ سکوں"۔

"ہاں۔ ہاں۔ کشور۔ رائے صاحب لالہ دھنراج۔ دھنراج اینڈ سنس لمیٹڈ"۔

دھنراج شوگر مل۔ کشور کلاتھ مل کے مالک کا اکلوتا بیٹا"۔

"تو آپ نے ابھی شادی نہیں کی"۔

"نہیں۔ چند سال تو آزادی سے گذارنے کا ارادہ ہے اس عرصہ میں کوئی رفیقہ حیات مل جائیگی آپ سے ملاقات ہو گئی اچھا ہوا۔ ایک دوسرے کو پہچان لینگے پھر جلد ہی ایک دوسرے کے ہو جائینگے"

"ٹھیک ہے کشور بابو۔ لیکن ایک گھڑی پہلے تو اس لڑکی پر جان چھڑک رہے تھے آپ اُس کو جانتے ہیں"۔

"جانتا تو نہیں البتہ یہاں سے کئی بار گذرتے دیکھا ہے"۔

"تو اس کا مکان آپ جانتے ہوں گے"۔

"مجھے کیا ضرورت ہے"۔

لتا اور کشور باتیں کرتے کرتے ایک کوٹھی کے جونہی بالمقابل پہنچے۔ لتا نے دیکھا وہی لڑکی برآمدہ میں کھڑی ہے۔

"لیجئے کشور بابو۔ میں نے آپکو اسکے گھر پہنچا ہی دیا۔ وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے"۔

"جانے دیجئے اب تو آپ ہی میری زندگی ہیں"۔

"اچھا میں ہی سہی۔ لیکن چلئے تو"

"لتا کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ کشور دل کانپ رہا تھا۔ لیکن انکار نہ کر سکا۔

"نمستے بہن"۔

"نمستے۔ آؤ بیٹھو"۔

"ضرور بیٹھوں گی اگر چائے مل جائے"۔

"کیوں نہیں"۔ رجنی نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر چائے رکھ کر چلا گیا۔

لتا نے چائے کا پیالہ لیتے ہوئے کہا۔ آپ نے کشور بابو کو تو چائے دی ہی نہیں جو آپ کیلئے مرتے ہیں۔ رجنی کے چہرہ پر غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ جو پاگل ہو جائے اسکا بھی کوئی علاج ہے بہن علاج تو ہے۔ بتائیے کشور بابو۔ پولیس کو بلا کر آپ کو ابھی سرکاری مہمان بنا دیا جائے۔ میرے خیال میں آپ کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

"اُرملا مجھے معاف کر دو میں بہت شرمندہ ہوں"۔

"اب معاف کر دوں تاکہ آپ پرائی بہنوں پر اپنا ہاتھ صاف کر سکیں یہ کبھی نہ ہوگا مسٹر"

"دیکھو اُرملا میرا باپ رئیس ہے۔ لاکھوں کا مالک ہے پھر اُسکی عزت کا خیال کرو۔"

بہت خوب! آپ کے پتاجی کی عزت کو دھبہ لگے گا لیکن ہمارے والدین کی عزت تو جیسے ہے ہی نہیں۔ اگر عزت کا خیال ہوتا تو آپ کبھی یہ حرکت نہ کرتے جلد بتائیے پولیس کو ٹیلیفون کر دیں

"نہیں نہیں اُرملا۔ اور جو دِل میں آئے سزا دے دو لیکن پولیس کو ہوا بھی نہ لگنے دو۔ میں کہیں کا نہ رہونگا۔ میری کسی جگہ شادی نہ ہو سکیگی میری زندگی تباہ ہو جائے گی"۔

"آپ کی شادی نہ ہو سکیگی۔ آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ لیکن ہماری شادیاں عزت کے ساتھ ہوں گی۔ ہماری زندگی بہشت بن جائیگی شرم نہیں آتی کہتے ہوئے۔

"اُٹھو بہن پہلے ٹیلیفون کرو"

رجنی کرسی سے اُٹھی کشور نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اب ہوش آیا کشور بابو۔ لیکن یوں معاف نہیں کیا جاتا۔ یا تو حوالات کی سیر یا ایک ہزار روپے نقد اور وہ بھی ابھی ——!!

"میرے پاس اس وقت دو سو روپے ہیں یہ لے لو باقی پھر دوں گا"۔

"پھر دونگا۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں اُدھار کا سودا نہیں مسٹر ابھی اور ابھی لائیے"

"میں نے تو کہا ہوں دو سو روپے لے لیجئے آٹھ سو روپیہ کل اسی وقت دے جاؤنگا"

"ضرور دے جاؤ گے۔ ایک دفعہ یہاں سے باہر قدم رکھا بس پھر غائب"۔

"رجنی دِل ہی دل میں مُسکرا رہی تھی"۔

"اچھا لائیے دو سو روپے۔ اور یہ لیجئے کاغذ اور پن۔ لکھئے پرونوٹ"۔

کشور نے فوراً پرونوٹ لکھ دیا اور دو سو روپے نکال کر دے دیئے۔

"کشور بابو۔ کل صبح کے آٹھ بجے جسٹس منتر کے پاس اگر آٹھ سو روپے نہ پہنچے تو یاد رکھنا پرونوٹ اور آپ کی کرتوت آپ کے پتا لالہ دھنراج جی کے گوش گذار کر دی جائے گی جائیے اب تشریف لے جائیے"۔

رجنی کشور کے جانے کے بعد زور زور سے ہنسی۔ بہن آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ

کبھی یہ جرکت نہ کر سکے گا۔ اور نہ اِس طرح سرِ بازار یہ آواز ے کسے گا۔

لتا گھر پہنچی۔ کانتا اسکے انتظار میں بیٹھی تھی۔ جُوں ہی لتا نے دروازہ کے اندر پاؤں رکھا

لتا نے کہا "تم بھی عجیب ہو۔ صبح نکلی اور شام کو واپس گھر آئی ہو"

"ہاں کانتا۔ ایک الجھن ہی ایسی آپڑی جس سے مشکل ابھی چھٹکارا ہوا ہے"۔

"میں بھی تو سُنوں"۔

"لتا نے سارا واقعہ سُنا دیا۔ دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں ——"

"تو کل صبح آٹھ سو روپے اور ملینگے"۔

"ہاں کیوں نہیں"؟

وہ اتنا بے وقوف ہے جو خود چل کر دینے آئے گا روپیہ۔

اگر وہ نہ آئے گا تو اس کا باپ تو چل کر آئے گا۔ دیکھنا پر نوٹ کی کرامات۔

کانتا پھر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

دوسرے روز صبح ہی لتا جنتر منتر پہنچ گئی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ کہ کشور سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

"لائیے امانت"۔

"کشور نے غصّہ سے لتا کو دیکھا اور جیب سے آٹھ نوٹ سو سو روپے کے نکال کر لتا کو دے دیئے۔

"اب آپ کو اجازت ہے تشریف لے جائیے"۔

جارہا ہوں۔ لیکن یاد رکھیگا اس کا بدلہ میں ضرور لوں گا۔
تمام شکر ادی۔ ضرور لینا بدلہ۔ کشور بابو۔

---

(۱۰)

کنول نے روانگی کی اطلاع پہلے ہی گھر دے دی تھی۔ جونہی گاڑی سٹیشن پر پہونچی۔ لالہ رادھے شیام خود سٹیشن پر لینے آئے تھے۔ آج دو سال کے بعد رادھے شیام نے اپنے لختِ جگر کو دیکھا تھا۔ گلے لگا کر سینکڑوں دعائیں دے ڈالیں۔

آخر تم آگئے بیٹا میری آنکھیں ہر گھڑی تیری راہ دیکھتی تھیں۔

"پتاجی معاف کرنا۔ اب میں کبھی دور نہیں رہوں گا"۔

"تو تم نے اس لڑکی سے ناطہ توڑ لیا؟"

"ہاں پتاجی۔ ناطہ ہی نہیں توڑ لیا بلکہ گھر سے نکال دیا۔ سول میرج تھی۔ توڑ دی"۔

"بہت اچھا کیا میرے کنول۔ لالہ بڈھے شاہ کو میں آج تک دم دلاسا دیتا رہا۔ اسکی اکلوتی بیٹی اب نوجوان ہو چکی ہے باہر کار میں وہ بھی آئی ہوئی ہے۔ بی۔ اے۔ پاس کر لیا ہے اس نے۔ تیرے بچپن کی ساتھی ہے اور میں نے لالہ بڈھے شاہ کو وچن بھی دیا ہوا ہے"۔

"بہت اچھا پتاجی۔ جو کچھ آپ نے کیا میری بہتری ہی کیلئے کیا ہوگا"۔

"مجھے یہی امید تھی میرے کنول"۔

کنول خوشی خوشی پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ کملیش سبز ساڑھی میں ملبوس ایکٹرس کی طرح کھڑی تھی۔ کنول کا دل دیکھتے ہی قابو سے نکل گیا۔ اور دل ہی دل میں پتا کے انتخاب کی داد دینے لگا۔

لتا نے ایک اچھی سی بلڈنگ کرائے پر لے لی اور اس میں استری سدھار نکیتن جاری کر دیا۔ رجنی اور کانتا کی ان تھک کوششوں سے چند ہی دنوں میں نکیتن کی لگ بھگ ایک سو لڑکیاں ممبر بن گئیں۔ نکیتن کا لکشن یہ رکھا گیا کہ استری جاتی کو نفس پرستوں سے کس طرح نجات دلائی جا سکتی ہے اور ان کو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ لتا کی دن رات کی سیوا نے نکیتن میں جان ڈال دی۔

ہر روز دس بارہ لڑکیاں ممبر بن جاتیں۔ ایک گھنٹہ روزانہ باقاعدہ استری سمبندھ پر لیکچر دیا جاتا اور باقی وقت میں کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جاتا۔

یکایک لتا بیمار ہو گئی۔ اس کے یہاں خوبصورت لڑکے نے جنم لیا۔ لتا کو خوشی تو ضرور ہوئی۔ لیکن اس خیال کے آتے ہی کہ جب لڑکا بڑا ہو گا تو کوئی اس کے باپ کے متعلق پوچھے گا تو کیا بتائے گی۔ تمام خوشی یاس میں تبدیل ہو گئی۔

لڑکے کا جنم ہونا تھا کہ لتا کی قسمت کا ستارہ بھی چمکنے لگا۔ ہر ایک پبلک جلسہ میں، لتا کو استری سمبندھ پر لیکچر دینے کی درخواست دی جاتی اس کے دل پر گہرے زخم کا گھاؤ تھا۔ کہنہ ولولے جو دل سے نکلتے تھے پبلک کے دل کو چیر دیتے تھے۔ استری جاتی میں تو اس نے خاص رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ کئی ایک سوسائٹیوں کی وہ چیرمین ہو گئی ادھر الیکشن کا وقت قریب آ رہا تھا۔ نکیتن کی کاریہ کرتاؤں کے کہنے پر اس نے الیکشن میں کھڑے ہونے کا نشچہ بھی کر لیا۔

کملیش اور کنول کی ملاقاتیں بڑھ رہی تھیں محبت بھی اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی۔ مارن موہن کملیش سے محبت کرتا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ کنول

اور کملیش ایک جان دو قالب ہو رہے ہیں تو اس کے دل میں حسد کی آگ سلگ اٹھی اس نے کنول سے میل جول بڑھا لیا۔ اور اس کو شراب کی عادت بد میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کملیش کو اس سے نفرت ہو گئی ۔نفرت ہوتی گئی ۔

کنول کی شادی کملیش سے ہو گئی۔ شادی کی رات کنول شراب کے نشہ میں بدمست کمرے میں داخل ہوا۔ کملیش تمناؤں کا گلدستہ لئے انتظار کر رہی تھی کنول کو نشہ کی حالت میں دیکھ کر چیخ اُٹھی۔

کنول جونہی کملیش کے نزدیک پہنچا وہ دُور ہٹ گئی ۔

"یہ کیا کملیش ــــــ؟"

"وہی جسکے آپ مستحق ہیں"۔

"آپ کا مطلب"۔

"پہلے اپنی صورت آئینہ میں دیکھئے"۔

"کملیش میں نے شادی اسلئے نہیں کی کہ تم میری بے عزتی کرو"۔

اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ اِسی حال چلن کے حامل ہیں تو میں کبھی بھی شادی نہ کرتی۔

دوسری صبح کملیش میکے چلی گئی ــــ"

(۱۰)

لالہ رادھے شیام کو جب معلوم ہوا کہ کنول رات کو شراب پی کر آیا تھا اور کملیش چلی گئی ہے تو ان کے دل کو صدمہ پہنچا جس کی وہ تاب نہ لا سکتے اور دوسرے دِن صبح دس بجے خون کا دباؤ بڑھ گیا۔ تمام علاج بے سُود ثابت ہوئے اور شام کے چار بجے اُن کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔ لالہ رادھے شیام کے گاڑھے پسینے کی کمائی لٹنے لگی۔ کنول کی

خوشنودی کے لئے ہر ہفتہ اعلیٰ پیمانہ پر اعلیٰ پارٹی کا انتظام کیا جاتا۔ اور بتایا جاتا کہ انکم ٹیکس سے روپیہ بچانے کا یہی محفوظ ترین طریقہ ہے۔ کنول کو بھی ہفتہ دس دن کے بعد پانچ دس ہزار روپیہ دے دیا جاتا۔ دولت کم ہوتی جارہی تھی اسکے برعکس جائیداد کی زیادہ سے زیادہ مالیت دکھائی جاتی۔ منیجر سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اپنا ہیڈ آفس دہلی میں منتقل کر لیا اور بیس ہزار روپیہ پگڑی دے کر آفس کھولا گیا۔

مدن موہن اور کملیش کی محبّت کے چرچے ہر گلی کُوچے میں ہونے لگے اور آخر کملیش نے کنول کے چلے آنے کے بعد مدن موہن کے شادی کر لی۔

الیکشن کا پروپیگنڈا زوروں پر تھا۔ لتا کا حریف لالہ بنواری لال ایک امیر اور مشہور ہستیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اُس نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ لیکن لتا کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُسے بُری طرح شکست ہوئی۔ لتا میونسپل کمشنر منتخب ہو گئی۔ لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہی معمولی شلوار اور قمیض وہی معمولی چپل وہی کھدّر کا دوپٹہ۔ وہی پریم بھاؤ۔ جو بھی اسکے پاس آتا تن من دھن سے اُس کی سہائتا کرتی۔ چند ہی دنوں میں لتا کی شہرت پھیل گئی۔

لالہ بنواری لال کو اس بات کا رنج تھا کہ وہ الیکشن ہار گیا ہے اس نے ایک عورت سے شکست کھائی نکیتن کی معمولی کاریہ کرتا نے اُسے نیچا دکھایا ہے۔

کنول بنواری لال کا کلاس فیلو تھا ـــــ اُس نے اِس بات کا ذکر کنول سے کیا وہ تو پہلے ہی عورتوں کی مخالفت میں اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ لتا نے بنواری کو پچھاڑا ہے اُس کے دماغ میں غیظ و غضب کا طوفان اُٹھا اور کہنے لگا۔

مسٹر بنواری لال مجھے افسوس ہے کہ تم کچھ نہ کر سکے۔ دولت تمہارے پاس اچھی ہے

عزت تمہارے قدم چومتی ہے۔ پولیس والے تمہاری مٹھی میں ہیں۔ حکومت کے کارکن تمہارے اشارے پر ناچتے تھے۔ پھر ایسے وقت میں کیوں دولت سے موہ کیا۔ کیوں نہ تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ کیوں نہ ایک ایک ووٹ سو سو روپیہ میں نہ خرید گیا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا دیکھنا میں کیا کرد کھاتا ہوں۔ اس نکسٹین کا اگر نام و نشان نہ مٹا دوں تو میرا کنول نام نہیں

خوشی کی مدت گذری معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن مصیبت کی رات کٹنے میں نہیں آتی۔ لتا کی زندگی خوش نصیب کی زندگی تھی۔ رُوپ نے بی۔ اے پاس کر لیا تھا اسے کالج کے دنوں سے نکیتن کی کاریہ کرتا کی بیٹی چنچل سے محبت تھی۔ لتا بھی اِس بات کو جانتی تھی۔ اُس نے رُوپ سے چھپائے رکھا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔

کنول نے نکیتن کے خلاف اخبارات کے ذریعہ کافی زہر اُگلا۔ اس پر اکتفا کرتا تو تو بات تھی۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ نکیتن کی سنچالک ایک آوارہ عورت تھی جس نے اپنی آبرو فروخت کر کے یہ مُمتاز پوزیشن حاصل کی ہے۔ لتا نے اخبارات میں ایسے مضمون پڑھے۔ لیکن اُسے ملال نہ ہوا۔

رُوپ نے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد "روپ فائنس لمیٹڈ فرم جاری کر دی لوگوں سے ڈیپازٹ لینا اور بیوپاریوں کو قرضہ دینا فرم کا مقصد و مدعا تھا قرضخواہوں کا تانتا بندھ گیا۔ لتا کے پاس خود اتنا سرمایہ نہ تھا۔ اس نے اپنے چند بہی خواہوں سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے فوراً کمپنی میں اپنا ڈیپازٹ جمع ادیا۔

کنول کی لاپروائی۔ ناتجربہ کاری۔ فضول خرچی کی بدولت شوگر مل بند ہو گئی زلا

والا مکان نیلام ہوگیا۔ ادھر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ نے شک کی بنا پر حساب کتاب کی جانچ پڑتال شروع کر دی۔ جب اُس میں سے بد دیانتی کی بُو آئی تو فرم کے ناجائز اخراجات رد کر دیئے اور ایک لاکھ چالیس ہزار روپے انکم ٹیکس لگا دیا۔ کنول کے پاس بل میں سوائے مشینری کے اور کچھ نہ تھا بصورت عدم ادائیگی انکم ٹیکس حوالات کا آہنی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے رُوپ فائنس کے پاس اپنی تمام مشینری و جائیداد گروی رکھ کر انکم ٹیکس بے باق کر دیا۔

دِن گذر رہے تھے اور سُود کا بوجھ کنول کے سر پر چڑھ رہا تھا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ کنول روپیہ ہر ماہ ادا نہ کر سکا۔ آخر روپ نے بذریعہ وکیل نوٹس دے دیا۔ کنول نے نوٹس پڑھا۔ کوئی صورت ادائیگی کی دکھائی نہ دی۔ وہ خود روپ کے پاس آیا۔

"مسٹر روپ میں لاکھوں کی جائیداد کا مالک تھا۔ لیکن گردش زمانہ نے مجھے آج آپکے پاس بد کاری کے روپ میں لا بٹھایا ہے۔ میں آپ سے چند ماہ اور مہلت مانگتا ہوں آپ کی ایک ایک پائی بے باق کر دوں گا۔"

"لیکن رائے صاحب مجھے سوائے بل کے اور کوئی جائیداد بھی تو دکھائی نہیں دیتی جہاں سے روپیہ وصول کر سکوں گا۔ جتنی دیر ادائیگی میں ہوگی اتنی جائیداد کی قیمت کم ہوتی جائے گی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں اِن حالات میں کیسے آنکھیں مُوند سکتا ہوں آپ بل کی قیمت لگا لیں اور کمپنی کے نام منتقل دیں۔

"بل کو فروخت کر دوں گا یہ نہ ہو سکے گا۔ کبھی نہ ہو سکے گا مسٹر روپ۔"

"کون کہتا ہے رائے صاحب کہ آپ بل فروخت کر دیں۔ میں نے تو اپنا سود مانگتا

ہوں۔ اصل زر کا مطالبہ کیا ہی نہیں"۔

"ایک ماہ کی مہلت اور دے دیجئے"۔

"آپ ایک ماہ کہتے ہیں۔ اگر آپ دو ماہ کے اندر بھی سُود کی رقم ادا کر دیں تو میں عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاؤں گا"۔

کنول گھر پہنچا۔ مسٹر روپ سے ملنے کے بعد اس کا دِل نہ معلوم کیوں روپ کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ کتنا شریف ہے اگر کوئی اور ہوتا تو کبھی مہلت نہ دیتا۔ شکل و صورت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی لباس میں کوئی دیوتا ہے۔

ایک ماہ گذر گیا۔ لیکن کنول بندوبست نہ کر سکا۔ دوسرا ماہ بھی نصف گذر گیا لیکن روپیہ کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ جُوں جُوں دن گذرتا کنول زیادہ متفکر ہوتا جاتا۔ مہینے کا آخری دن تھا قرضہ کا بوجھ اس کے دل پہ اتنا ہوا کہ خون کا دباؤ بڑھ گیا فیملی ڈاکٹر نے کوشش میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر اس نے نوکر کو روپ کے پاس بھیجا۔ روپ نے جونہی کنول کی بیماری کی خبر سُنی اُس پہ بے ہوشی طاری ہو گئی جب ذرا سنبھلا فوراً کار لی اور سیدھا کنول کی کوٹھی پر پہنچا۔ کنول بستر پہ دراز تھا ڈاکٹر انجکشن کر رہا تھا۔

"آیئے مسٹر روپ میرے پاس آیئے"۔

وکیل سے بات طے کیجئے اور مل کی رجسٹری لکھ لیجئے اب میں چند گھنٹوں کا مہمان ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ جیتے جی آپ کے قرضے سے سُبکدوش ہو جاؤں۔ رُوپ نے اُسی وقت وکیل کو ٹیلیفون کر دیا۔ چند منٹوں میں وکیل آ پہونچا۔

وکیل صاحب میری شوگر مل کی ملکیت بنام مسٹر رُوپ منتقل کر دیجئے قرضہ سمیت سود ایک

لاکھ اٹھتر ہزار روپے نقد کے عوض دیجئے۔ جلدی تاکہ میں ہوش میں دستخط کر سکوں

وکیل نے تحریر نامہ لکھا اور کنول کو سُنانے لگا

"منکہ رتلام شوگر مل موسومہ رادھے شیام شوگر مل جو کہ میری واحد ملکیت ہے۔ کہ بالعوض مبلغ ایک لاکھ اٹھتر ہزار روپے بدست مسٹر روپ کشور ولد مسٹر کنول کرشن قوم اروڑہ ساکن روپ محل دہلی بیع قطعی کرتا ہوں"۔

کنول کی آنکھیں کھل گئیں۔

وکیل صاحب ذرا ٹھہرنا۔

"مسٹر روپ۔ آپ کے والد کہاں ہیں"؟

"میں نے اُن کے درشن تو کئے نہیں لیکن ماں کہتی ہے کہ وہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں"۔

"آپ کی ماتا جی کا کیا نام ہے"۔

"لتا دیوی"۔

"لتا۔ لتا کہاں ہے رُوپ۔ ایک بار تم اپنی ماں کو یہاں بُلاؤ۔ تاکہ میں مرنے کے بعد میری رُوح کو شانتی مل سکے"۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکا"۔

"رُوپ وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی کرو جلدی کرو"۔

"روپ نے وہاں ہی سے ماں کو ٹیلیفون پر بُلایا اور کہا کار بھیجدی ہے جلدی آنا"۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"یہاں آکر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھے خود کچھ معلوم نہیں"۔

لتا کار میں فوراً آپہنچی۔ جونہی اُس کی نظر کنول پر پڑی۔ استری دھرم

نے جوش مارا کے اختیار ہو کر۔

کنول نے آنکھ کھولی۔ تتا کو پاؤں پر دیکھا۔ آنسوؤں کی دھارا بہنے لگی۔

"تتا تمہارا گنہگار ہوں مجھے معاف کر دو۔ میں ہیرے کی قیمت نہ جان سکا۔ پیتل کے ٹکڑوں سے پیار کرتا رہا جس کی سزا مجھے مل رہی ہے"۔

"ماں یہ کون ہیں"۔

"رُوپ تیری بدنصیب ماں کا سوہاگ یہ پتا جی ہیں"۔

"پتا جی ——— آپ نہیں مر سکتے۔ یہ سب کچھ آپ کا ہی تو ہے۔ یہ دیکھئے رجسٹری۔

رُوپ نے رجسٹری کے ٹکڑے کر دیئے۔ اور جو پرونوٹ قرضہ کا تھا اُسے چاک کر دیا۔

دُور دُور آسمان پر ستارے اس مُدھر ملن پر مسکرا رہے تھے۔ جگمگا رہے تھے۔

شیاما

راجندر آج نشہ میں مخمور تھا۔ اُس کا قدم تیزی سے اُٹھ رہا تھا۔ جب وہ فضل بلڈنگ کے پاس پہنچا تو اس کے قدموں نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ دل کہہ رہا تھا۔ کہ آج تو نشہ میں نہیں۔ تو پھر کیوں بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ دِل کی نصیحت نصیحت ہی رہی اور قدم یکایک سیڑھیوں کی طرف چل پڑے اور وہاں ہی جا کر رُکے جہاں رات شب ۱۰ بجے دروازہ بند ہونے کی وجہ سے رُکا کرتے تھے۔ آج دروازہ کھُلا ہوا تھا لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ شیاما گا رہی تھی اور پرستار چند ایک بیٹھے تھے اور وہ بھی روزانہ کے گاہک شیاما نے راجندر کو دیکھا۔ آنکھوں کے اشارے سے ہی اجازت اندر آنے کی دے دی۔

راجندر کمرہ میں داخل ہوا۔ آج نمعلوم اُس کے پاؤں کیوں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ چپکے سے جا کر بیٹھ گیا۔ آج اُس نے ہر روز کی طرح واہ واہ نہیں کی۔ مست آنکھوں

سے شیاما کو اپنی طرف نہیں بُلایا تھا۔ ہر ایک گانے پر نوٹوں کا بنڈل جیب سے نہیں نکالا تھا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ آج کیوں آیا۔ جب شراب جیسی بُری عادت چھوڑ دی تو یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اُس نے شیاما کی طرف نظر اُٹھائی دِل نے آواز دی۔ یہاں سے بھاگ جا۔ راجندر بھاگ جا۔ لیکن آنکھیں دیوانہ وار شیاما کے حُسن دلفریب کے نظارہ میں محو تھیں۔ جانے کا نام کون لے آخر گانا ختم ہوا۔

"کیا بات ہے سرکار! آج پجاری بن گئے کیا؟"

"ہاں ہاں۔ دیوی کا پجاری"۔

"پیسا کیا چھوڑ دیا؟"

"ہاں چھوڑ دیا ــــ اور ممکن ہے یہاں آنا بھی چھوٹ جائے"۔

"یہاں آنا بھی"؟ شیاما نے قدرے حیرانی سے کہا "اگر آپ نے آنا چھوڑ دیا تو ہم کہاں جائینگے؟"

"میں کیا جانوں"

"ایک پیگ لے آؤں سرکار؟"

"نہیں نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے"۔

"اگر کچھ نہیں چاہیئے تھا تو آئے ہی کیوں تھے دوسرے کے دل کو چوٹ پہنچانے"۔

"آیندہ نہیں آؤنگا۔ نہیں آؤنگا شیاما"۔

راجندر نے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور شیاما کے سامنے پھینک دیا۔ "یہ لو جسکی تمہیں ضرورت ہے"۔

"نہیں چاہیئے راجندر مجھے یہ روپیہ نہیں چاہیئے"۔

"تو پھر اور کیا چاہیئے؟"

"آپ ایک جام نوش کر لیں تاکہ میں اپنی تصویر آپ کی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔

"شیاما میں نے شراب اس لیے چھوڑی ہے کہ تمہاری تصویر اصلی روپ میں دیکھ سکوں"۔

"میں تو وہی ہوں۔ راجندر۔ وہی شیاما۔ لیکن آج آپ راجندر نہیں ہیں"۔

"ہاں۔ میں اصلی راجندر ہوں، نقلی نہیں"۔

"تو پھر کیا میرے لئے ایک جام بھی نہیں لینگے۔ میری قسم، میری جان کی قسم صرف ایک جام"۔

"نہیں شیاما ہرگز نہیں۔ اب میں تا زندگی اس کو منہ نہیں لگاؤنگا"۔

"میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ کیا مجھے برباد ہوتا دیکھ سکو گے راجندر۔ ایک روشنی دکھائی دی تھی۔ وہ بھی اندھیرے کی شکل اختیار کئے جا رہی ہے"۔

"شیاما! میں خود اندھیرے میں ہوں" یہ کہہ کر راجندر وہاں سے چلا گیا۔ شیاما سامنے بھی کی۔ اس کی مست آنکھوں نے جادو بھی کیا۔ ناگن سی زلفوں نے راجندر کو ڈس بھی لیا۔ نازک کلائیوں نے راجندر کو پکڑا بھی۔ لیکن پھر بھی وہ چلا گیا۔ اور حسب عادت روپیہ بھی دے گیا۔

شیاما کی آنکھیں راجندر کو دیکھتی رہیں۔ جب تک کہ وہ سڑک پر تیز قدم جاتا دکھائی دیتا رہا۔ واپس آکر شیاما نے نوٹ نوٹ نہ اٹھائے۔ دوسرے کہ وہیں چلی گئی لیکن پھر لوٹ آئی اور نوٹ اٹھا لئے۔

راجندر گھر پہنچا۔ بے تحاشا چارپائی پر جا کر پڑ گیا۔ آج اس کو بھوک نہ تھی اور

نہ ہی نیند۔ وہ کروٹیں شیاما لیتا رہا۔ یا کمرہ کے چکر کاٹتا رہا۔ گھڑی نے دو بجائے اور وہ چارپائی پر جا گرا۔

اتنی رات گزر گئی نیند کیوں نہیں آتی۔ صبح آفس جانا ہے۔ کام نہیں ہوگا۔ کیا شراب کے چھوڑنے سے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ الماری کے پاس گیا وائٹ ہارس کی بوتل نکالی میز پر رکھی۔ گلاس لایا۔ ایک پگ ڈالا۔ ہاتھ میں لیا۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے شیاما کی معصوم تصویر گھومنے لگی اور کانوں میں آواز۔

"ایک جام۔ راجندر! صرف میرے لئے"۔

"نہیں نہیں۔ میں نہیں لونگا"۔ اس نے گلاس پٹک دیا اور چارپائی پر گر پڑا۔

چار دن گذر گئے۔ راجندر شیاما کے گھر نہیں گیا۔ شیاما صبح سے گھڑیاں گن گن کر شام کا انتظار کرتی۔ اور جب انتظار کی گھڑیاں ختم نہ ہوتیں تو آنچل سے منہ چھپا لیتی اب اس کی آنکھوں میں نیند کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔ گانا اس نے بند کر دیا تھا۔ اور ہارمونیم بیکار بھی ہو گیا تھا۔

اُدھر راجندر بھی نہ سو سکا تھا۔ نہ ہی اس نے پیٹ بھر کھانا کھایا تھا اور نہ ہی شیاما کے گھر جانے کو تیار ہوا تھا۔ دو دن متواتر وقت پر گھر سے نکلا۔ نصف راستہ تک گیا۔ لیکن پھر واپس چلا آیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ دل میں درد تھا۔ وہ کرسی پر جا کر لیٹ گیا۔ پھر اٹھا۔ الماری کے پاس گیا۔ بوتل نکالی اور گلاس میں پگ ڈالا منہ کے پاس لے گیا۔ اتنے میں دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے گلاس وہاں ہی رکھ کر دروازہ کھولا۔

"شیاما! تم یہاں"۔

"ہاں راجندر تم لینے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے"۔" یہ کہہ کر شیاما اندر چلی آئی۔ میز پر شراب کی بوتل دیکھی۔ اور گلاس میں شراب کا جام۔

"یہ کیا راجندر آپ نے تو چھوڑ دی تھی"۔

"ہاں چھوڑ دی تھی اور اب بھی چھوڑی ہوئی ہے"۔

"تو پھر یہ کس لئے؟"

"آپ کے لئے"۔

"میں نے تو آج تک کبھی نہیں پی۔ میں تو ساقی ہوں۔ لیجئے ناپی لیجئے"۔

"نہیں شیاما میں نہیں پیوں گا"۔

"کیا میرے ہاتھ سے نہیں پیتے۔ تو لو اپنے ہاتھ سے ہی پی لیجئے"۔

"اچھا لاؤ"

شیاما نے گلاس راجندر کو دیا۔ اُس نے گلاس زمین پر اُلٹ دیا۔ بوتل اٹھائی اور باہر پھینک دی۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا"۔ شیاما نے کہا۔ میرے آنے سے پہلے آپ پینے لگے تھے۔ میں آئی تو اُلٹ دی۔ شرم آتی ہے تو لو میں چلی جاتی ہوں"۔

"نہیں، نہیں شیاما یہ بات نہیں ہے"۔

"تو پھر کیا ہے"؟

"میں آج چار دِن سے نہیں سویا۔ آنکھوں میں نیند نہیں آتی۔ کلیجہ میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ آج زیادہ اُداس ہو گیا تو اس کو نکالا۔ اِس خیال سے کہ یہ دماغ کا توازن کھو دے گی۔ افکار سے بے نیاز کر دے گی اور پھر قدم بلا سوچے سمجھے آپ کے ہاں

پہنچا دینگے۔ لیکن اب آپ یہاں آگئیں ہیں"

"میں بھی تو اسی لئے پلاتی تھی کہ آپ روزانہ آتے رہیں۔ لیکن اب نہیں پلاؤں گی راجندر نہیں پلاؤنگی۔ اور کبھی نہیں"۔

"کس طرح آنا ہوا؟ معاف کرنا یہ پوچھنا بھول ہی گیا"۔

"میں تو اس لئے آئی ہوں کہ ناراضگی کی وجہ معلوم کر سکوں"۔

"شیاما اس کو پردۂ راز میں ہی رہنے دو۔ دونوں کیلئے اچھا ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے کیا حق ہے۔ میں تو ویشیا ہوں۔ گو جنم سے نہیں قسمت سے"

"کیا مطلب۔ آپ نے ان کے ہاں جنم نہیں لیا"؟

"نہیں بالکل نہیں"۔

"تو پھر یہاں کس طرح۔؟"

"یہ ایک دردناک داستان ہے۔ پھر کبھی بتاؤں گی"۔

"آج ہی کیوں نہیں"؟

"آج وقت نہیں۔ بغیر بتائے گھر سے نکلی تھی۔ اب واپس جانا ضروری ہے۔ ورنہ ....."

"ورنہ کیا وہ گھر سے باہر کر دینگے"؟

"باہر تو نہیں کر سکتے راجندر کیونکہ ان کا گذارہ میری آمدنی پر ہے۔ لیکن بلا وجہ غصے ہوں گے"۔

"اچھا تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

"لوگ بدنام کرینگے۔ آپ کی بدنامی مجھے گوارا نہیں"۔

"مجھے بدنامی کا ڈر نہیں۔ اور نہ ہی کوئی مجھے اپنے راستہ سے روک سکتا ہے"۔

چنانچہ راجندر شیاما کے ساتھ ہو لیا۔ سڑک پر راجندر کا مالک کار میں جا رہا تھا وہ کئی دفعہ شیاما کے درِ دولت پر سجدہ کر آیا تھا۔ راجندر کو شیاما کے ساتھ دیکھ کر کار کو کھڑا کیا۔ اور راجندر کو آواز دی۔

راجندر نے مدن موہن کو دیکھا۔ پہلے تو جھجکا۔ لیکن پھر فوراً کار کے پاس پہنچ گیا

"نمستے!"

"نمستے۔ یہ ساتھ کون ہے؟"

"شیاما"۔

"تو آپ کو یہ بھی شوق ہے"۔

"شوق نہیں سماج سُدھار"

"تو آپ اس کو لیکر سرِ بازار سماج سُدھار کرتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو بہت شریف سمجھا ہوا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ کی اصلیت کیا ہے"۔

"شکر ہے۔ آپ کو میرا اصلی رُوپ نظر آ گیا"۔

مدن موہن کار کو لے کر چلا گیا۔ راجندر شیاما کے پاس آ گیا۔

"یہ کون تھا؟"

"اِن کے ہاں میں ملازمت کرتا ہوں"۔

"تو آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر ناراض ہوا ہوگا"۔

"ہوا ہوگا تو کیا ہوا۔ شیاما! مجھے ملازمت سے ہی جواب دے دیگا۔ لیکن مجھے اپنے راستہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا"۔

"راجندر! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ساتھ نہ چلو"۔

"پگلی شیاما، تو کیا جانے"۔

دوسرا دن بخیریت گذرا۔ اگلے روز جونہی راجندر دفتر پہنچا۔ چپراسی نے کہا۔

"صاحب نے یاد کیا ہے"۔ راجندر سیدھا مدن موہن کے کمرہ میں چلا گیا۔

"نمستے جناب"۔

"راجندر، تمہاری حرکات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تم کو یہاں سے تبدیل کر دوں چنانچہ بذریعہ تار کلکتہ سے منظوری لے لی ہے۔ ایک دو دن میں جانے کا انتظام کر کے روانہ ہو جاؤ۔ راجندر تم نوجوان ہو۔ میری نصیحت ہے کہ اپنی جوانی کو بازاری حسن میں برباد کرنا چھوڑ دو"۔

راجندر نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور بغیر نمستے کئے باہر چلا آیا۔ فائلوں کی لسٹ تیار کی اور دوسرے کلرک کو چارج دے کر ایڈوانس خرچ لے کر گھر آ گیا۔ اُس کو ذرا بھی رنج نہ ہوا کہ شیاما کی وجہ سے اُس کا تبادلہ ہوا ہے۔ شیاما کی جُدائی کا اُس کو رنج ضرور تھا۔ لیکن ساتھ ہی اُمید کی جھلک بھی تھی۔ اُس نے خوشی خوشی سامان باندھا کھانا کھایا اور شیاما کے گھر کو روانہ ہو گیا۔ شیاما کے مکان پر پہنچا۔ گانے کی اور واہ واہ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ دروازہ حسب معمول بند تھا۔ وہ خیالات کا اتنا بوجھ اُٹھائے ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ دروازہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور وہ وہاں سے ہی واپس ہو لیا ——

کلکتہ میل پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ دو دلوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لیے وہ آج ایک غضبناک شکل اختیار کر رہی تھی۔ راجندر کھڑکی کے پاس

پتھر کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے باوجود اُس کی پیشانی پسینہ سے تر تھی۔ وہ خود ہی بڑبڑایا۔

"راجندر تُو نے غلطی کی۔ ایک نظر بھی شیاما کو نہ دیکھ پایا۔ جب اُس کو معلوم ہوگا تو کیا کہے گی وُہ۔ اُس کا معصوم دِل ٹوٹ جائے گا۔ رات گزر چکی تھی۔ گاڑی لکھنؤ پہنچ چکی تھی۔ لیکن راجندر کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ گاڑی پر سوار ہے۔ یا مکان کی چار دیواری میں اپنی اُمیدوں کا خون ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اُسکے خیالات کا تانتا اُس وقت ٹوٹا جب چائے والے نے آواز دی "بابو صاحب! چائے کا سیٹ لے آؤں؟"

"ہاں لے آؤ۔"

راجندر نے چائے پی اور برتھ پر لیٹ گیا۔ دُوسری صبح ہی اُس کی آنکھ کھلی جبکہ وہ ہوڑہ سٹیشن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی سامان سنبھالا۔

شیاما نے انتظار میں بیٹھے بیٹھے رات گزار دی، لیکن راجندر نہ آیا۔ اُس کو کیا معلوم تھا کہ راجندر اُس کے ارمانوں کا خون کر کے دُور جا رہا ہے۔ خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور شیاما اُس کے بہاؤ میں بہے جا رہی تھی۔ اُسکو شک تو گزرا کہ ضرور کچھ بات ہوئی ہے۔ لیکن راجندر کے بلند حوصلے کے مُقابلہ میں اُس کو یقین نہ آتا تھا وہ خود راجندر کے دِل میں محبت کی آگ سُلگتے دیکھ آئی تھی، صبح ہوتی، شام ہوتی لیکن اُس کے آنسو ایک منٹ بھی آنکھوں سے نہ تھمتے۔

اُس نے نوکر کو ساتھ لیا اور سیر کے بہانہ راجندر کے مکان کو چل پڑی دروازہ مقفل دیکھا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ پاس ہی لڑکے کھیل رہے تھے اُن سے پوچھا کہ صاحب یہاں رہتے تھے، کہاں گئے ہیں؟ لڑکوں کا جواب سُنکر کہ وہ کلکتہ چلے

گئے ہیں، شیاما کے حواس باختہ ہو گئے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور چند قدم آگے جا کر واپس گھر کو لوٹ آئی۔ لیکن ساتھ کیا لائی بُخار کی مصیبت۔ وہ پلنگ پر جا گری آنسوؤں سے بھگو دیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ بھی کلکت چلی جائے گی اور راجندر کی تلاش کرے گی۔

شیاما نے چار پانچ دن پلنگ پر پڑے پڑے گزار دیئے۔ بخار دن بدن تیز ہوتا گیا۔ اور چلنے کے بھی ناقابل ہوتی گئی۔ لیکن اُس کے ارادے میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ ایک رات قسمت نے اُس کی مدد کی۔ سب محوِ خواب پڑے سو رہے تھے۔ وہ موقعہ غنیمت سمجھ کر بُخار کی حالت میں ہی چپکے سے باہر نکل گئی۔ بیماری کی وجہ سے اُس کو کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ وہ سیدھی سٹیشن کی جانب چل پڑی۔ اُس نے سُکھ کا سانس لیا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی گاڑی پنجاب میل تھی اور ٹکٹ کلکتہ کا تھا۔ سہارنپور پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ وہ دوسری سمت جا رہی ہے چنانچہ وہ اُتری اور دوسری گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر بیٹھ گئی۔ کئی گھنٹوں بعد اُس کو کلکتہ میل ملی۔ وہ سوار ہو گئی۔ گاڑی کی رفتار سے شیاما کی زندگی کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ آخر گاڑی ہوڑہ پہنچی۔ شیاما گاڑی سے اُتر پڑی۔ کوئی بستر نہیں کوئی سامان نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جائے تو کہاں جائے۔ چلنے سے پہلے اُس نے کچھ روپے اسی غرض سے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ ٹکٹ کے کرائے کے بعد اب اس کے پاس اتنے روپے بھی نہیں کہ چار پانچ دن بھی ہوٹل میں رہ کر گزار سکے۔ اور پھر کیا یقین کہ اس عرصہ میں اُسے راجندر ملے بھی یا نہیں چنانچہ اُس نے باہر آ کر ایک رکشا لی اور پنجابی دھرم شالہ پہنچانے کو کہا۔

دوسرے دن شیاما ہسپتال میں پہنچی اور وہاں چپڑاسی بھرتی ہوگئی۔ اب اسکو رہنے کیلئے جگہ مل گئی اور کھانے کیلئے بھی ہوٹل میں انتظام ہوگیا۔ ہسپتال سے فارغ ہوکر اس کا کام تھا راجندر کی تلاش۔ کافی رات گئے ناکام واپس لوٹتی۔ اور رات بھر سرد آہیں بھرتی رہتی۔

راجندر کلکتہ میں تھا لیکن تصور اس کا فضل بلڈنگ شیاما کے کمرہ میں جونہی شام کے ۸ بجتے۔ اُس کے قدم خود بخود چل پڑتے اور تب تک نہ ٹھہرتے جب تک کہ وہ بالکل نہ لڑکھڑا جاتے۔ وہ واپس بیہوش ہوکر پلنگ پر نیم بسمل کی طرح تڑپتا رہتا آخر یہ حالت کب تک صحت کمزور ہو چلی تھی۔ چلنے کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔ دفتر میں وہ کام تو کرتا تھا۔ لیکن قابلیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک پرانے کلرک کی حیثیت سے۔

ایک شام اسی عالم میں ہسپتال کے قریب سے گذر رہا تھا کہ موٹر کار کی زد میں آگیا۔ گر گیا چوٹ آئی۔ ڈرائیور ڈر کر بھاگ گیا اور راجندر بے ہوش سڑک کے کنارے پڑا رہا۔ شیاما راجندر کی تلاش کرنے کے بعد ناامید ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس لوٹ رہی تھی۔ پاؤں جو لڑکھڑائے راجندر کے جسم کو جا لگے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ ایک نوجوان کو زخمی پایا۔

"کیا ہوا؟"

"موٹر سے ٹکر ہوگئی۔ زخم گہرا ہے۔ کسی ہسپتال میں پہنچا دیجئے بھلا ہوگا۔"

"لیکن اس وقت تو ہسپتال میں کوئی نہ ہوگا۔ اچھا اُٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔"

شیاما نے سہارا دے کر راجندر کو اُٹھایا۔ اس کے جسم میں سنسنی پیدا ہوئی۔

لیکن وہ پہچان نہ سکی۔ ہسپتال لے گئی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر نے حالت خطرناک دیکھی پلنگ پر لٹا دیا۔ شیاما کو دوائی و انجکشن لانے کو۔ شیاما نے ڈاکٹر کے کہنے پر جونہی راجندر کو اٹھایا۔ صورت دیکھی تو آہ نکل گئی۔ لیکن دوائی پلا دی۔

راجندر دوائی پیتے ہی بیہوش ہو گیا۔ شیاما اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی گھڑی نے دو بجا لیے۔ راجندر نے آنکھ کھولی۔

"پانی، پانی"

"لیجئے"

"آپ کون؟ میں کہاں ہوں"؟

"ہسپتال میں اور میں خادمہ ہوں"۔

"آپ نرس ہو کر اتنی رات گئے میرے پاس بیٹھی ہیں"۔

"ہاں آپ کی حالت جو خطرناک تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری ڈیوٹی لگائی تھی۔ اب آپ آرام کیجئے میں جاتی ہوں"۔

"یہ آواز تو میں نے پہلے بھی سُنی ہے"۔

"سُنی ہو گی ضرور۔ لیکن میں تو ہر روز آپ جیسے کئی مریض دیکھتی ہوں۔ آرام کیجئے۔ آپ کو پھر تکلیف ہو جائے گی"۔

یہ کہہ کر شیاما ناچتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ آج وہ کتنی خوش تھی —

وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اُس کو کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو۔ وہ پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ آنکھوں سے نیند اوجھل ہو گئی تھی۔ اب اُس کو چین کہاں تھا۔ پھر اُٹھی اور راجندر کے کمرہ میں دبے پاؤں چلی گئی۔

راجندر آنکھیں بند کئے گذرے ہوئے زمانہ کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ اور آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاؤں کی آہٹ سُن کر اُس نے آنکھیں کھولدیں شیاما ٹھٹک گئی۔

"آپ پھر؟"

"ہاں دیکھنے آئی تھی کہ آپ کو نیند آئی ہے یا نہیں۔ یہ لیجیے دوائی پی لیجیے"۔

راجندر نے دوائی پی لی اور لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے شیاما کی تصویر گھوم گئی اور بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ "شیاما شیاما!! آخر بھگوان نے مجھے زندگی دے دی"۔

"یہ شیاما کون ہے بابو جی؟ آپ کی بیوی؟ کہاں ہے مکان آپ کا؟ بتایئے میں ابھی جاکر اُن کو بُلالاتی ہُوں"۔

"نہیں، نہیں، یہاں نہیں وہ دہلی میں رہتی ہیں"۔

"پتہ دیجیے۔ تار دلوا دیتی ہوں۔ وہ آجائینگی"۔

"وہ نہیں آسکتیں اور نہ ہی اُنہیں آنا چاہیئے"۔

"یہ کیوں؟"

"آپ نہیں جانتیں۔ لیکن آپ کو اس قدر ہمدردی کیوں ہے؟ آپ تو نرس ہیں یہاں مجھ جیسے سینکڑوں مریض آتے ہیں"۔

"یہ ٹھیک ہے لیکن اُن میں آپ جیسا ایک بھی نہیں ہوتا"۔

اس فقرہ نے راجندر کو بھولے بسرے زمانہ کی یاد تازہ کرادی۔ جب وہ پہلی مرتبہ شیاما کے یہاں ایک دوست کے ساتھ دعوت پر گیا تھا۔ شیاما نے بھی کہا تھا

یہاں آئے تو بہت ہیں۔ لیکن آپ جیسا اُن میں ایک بھی نہیں ہوتا۔ راجندر کا دل دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بابو جی آپ تو رو رہے ہیں"۔

"نہیں تو"۔

"تو آنکھوں سے یہ کیا بہہ رہا ہے"؟

"کسی کی فرقت کی آگ بجھانے کے لیے خونِ دل بہہ نکلا ہے"۔

شیاما سے اب نہ رہا گیا۔ راجندر کے گلے سے چمٹ گئی۔ "راجندر میرے پیارے راجندر"!

شیاما اور راجندر اب اکٹھے رہتے تھے۔ دونوں کی زندگی بدل چکی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے تھے۔ ایک دن راجندر نے شیاما سے کہا۔

"شیاما میں حیران ہوں تم نے عیش و آرام کی زندگی کیسے چھوڑ دی"؟

"مجھے اس زندگی سے پیار نہ تھا راجندر بلکہ دلی نفرت تھی۔ مجبوریاں عورت کو کہاں تک لے جاتی ہیں۔ یہ آپ نہیں جانتے۔ جہاں بھی تھوڑی سی سچے پریم کی جھلک اُس کو دکھائی دیتی ہے۔ تو وہ عیش و عشرت اور آرام سب کچھ تیاگ کر اُس کی ہو لیتی ہے۔ یہ نہیں سوچتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا"۔

"آخر آپ وہاں سے بھاگ ہی آئیں"۔

"بھاگی، تو نہیں۔ کسی کا جذبِ کامل کھینچ لایا"۔

"اگر ایسا تھا تو مجھے وہاں ہی کیوں نہ کہا"؟

"کہتی کس طرح؟ میں تو ایک ویشیا تھی۔ سماج کی نظروں میں ایک بدنما دھبہ

سوسائٹی کے ماتھے پر ایک زبردست کلنک۔"

"اب تو وہ داغ نہیں رہا۔"

"ہاں! آپ کی محبت نے دھو ڈالا"۔

"شیاما تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تمہاری آپ بیتی بہت دردناک ہے۔ کیا مجھے نہیں سناؤ گی؟"

"راجندر! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں میری آپ بیتی میری موت کا سبب نہ بنجائے"

"ڈرو مت شیاما۔ تم جو کچھ بھی ہو، میری ہو۔ میری زندگی سے ڈراؤنی تمہاری کہانی نہ ہوگی"۔

"تو سنو راجندر"

"میں ایک متمول خاندان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ کے پیار کے سایہ میں پرورش پائی۔ میٹرک پاس کیا۔ ماں کو صرف ایک ہی غم تھا کہ کوئی خاندان کا نام روشن کرنے والا نہ تھا اور یہ غم اُس کو دیمک کی طرح کھائے جاتا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں۔ پتاجی نے بیماری پر کافی خرچ کیا۔ لیکن موت کے بے رحم پنجہ سے انہیں چھٹکارا نہ ملا۔ اور آخر ایک دن شام کے وقت وہ دنیا سے کوچ کر گئیں"۔

راجندر نے ایک سرد آہ بھری۔ "پھر کیا ہوا شیاما؟"

"پتاجی کیلئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ وہ اب دل لگا کر کام نہ کر سکتے تھے۔ انہیں سٹہ کھیلنے کی عادت تھی وہ بلا سوچے سمجھے خرید و فروخت کر لیتے۔ مالی حالت دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ انھوں نے عقلمندی سے کام لیا اور میری شادی گوجرانوالہ میں کر دی گئی۔ کافی ساز و سامان جہیز میں دیا

سُسرال پہنچی ۔ ساس کا سبھاؤ چند دنوں میں ہی معلوم ہو گیا ۔ معمولی بات پر اُن کو غصّہ آجاتا جس کو میں برداشت نہ کر سکتی تھی خُسر بہت شریف تھے ہر ایک بات میں میری ساس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے ۔ امیر تھے ۔ لاکھوں کے مالک لیکن رہن سہن معمولی گھرانے جیسا تھا ۔ میرے خیال میں یہی اُن کے دولتمند ہونے کا راز تھا ۔

"پتی دیو" کو جن کا میں نام نہیں لینا چاہتی ۔ میں نے سہاگ رات کو صرف چند منٹ کیلئے ہی دیکھا تھا وہ بیماری کا بہانہ کر کے وہاں سے چلے گئے ۔ میں دوسرے روز واپس میکے آگئی ۔ وہ مجھے چھوڑنے بھی نہ آئے ۔

ابھی چند دن ہی گذرے ہونگے کہ سُسرال سے چٹھی آئی جس میں لکھا تھا کہ میرے پتی دیو ، زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے کیلئے گھر سے بھاگ گئے ہیں ۔ میں سر پیٹ کر رہ گئی ۔ مجھے سُسرال چلی جانا پڑا ۔ پتاجی بھی میرے ساتھ گئے ۔ تین چار دن بعد آخر اُنہیں بھی اپنے داماد کی خودکشی کر لینے کا پتہ چل گیا ۔ وہ واپس چلے آئے اِدھر بنولے کا بھاؤ دن بدن نیچے ہوتا گیا ۔ اس طرح پتاجی کو لاکھوں روپے کا نقصان اُٹھانا پڑا ۔ جائیداد فروخت ہو گئی ۔ دکانوں کا سامان نیلام کر دیا گیا اور ایکدن میں نے اخبار میں پڑھا کہ لالہ جمنا داس کی نعش دریائے چناب میں تیرتی ہوئی پائی گئی ۔

پتی کی موت کے بعد سُسرال میں میری قدر و منزلت کم ہو گئی تھی اور ساس ہر ایک سے یہی کہتی کہ ناگن ہے ناگن ۔ آتے ہی میرے زندگی کے سہارے کو کھا گئی ۔ یہ سلسلہ کب تک رہ سکتا تھا ۔ باپ کی مرتیو کے بعد ساس سُسر نے اور بھی سخت رویّہ اختیار کر لیا ۔ اور آخر ایک دن کافی لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ کے بعد مجھے

گھر سے نکال دیا گیا۔

راجندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا "پھر کیا ہوا شیاما دیوی؟"

"اب میں تھی ـــــ زمانے کی گردش کا شکار۔ کوئی ٹھکانہ نظر نہ آتا تھا۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ باپ کا گھر نہیں سسرال والوں نے نکال دیا۔ صرف ایک سہارا دکھائی دیتا تھا اور وہ تھا چاچی کا گھر۔ لیکن پتاجی کے تعلقات زندگی میں اُن سے اچھے نہ تھے اور میں زندگی میں صرف ایک بار اُن کے ہاں گئی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا میں چاچا کے گھر پہنچی اور اُن سے اپنی حالت بیان کی۔ خاندانی خون نے جوش مارا اور انھوں نے مجھے اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ چاچی بھی خاموش ہی رہی۔ ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ ایک رات کھانا کھانے کے بعد چاچی نے چاچا سے کہا۔

"منورما نوجوان ہے اور خوبصورت بھی۔ کب تک اس طرح کی زندگی گذارے گی اگر جوانی کے نشے میں اس نے ایسی ویسی حرکت کر دی تو خاندان کا نام مٹی میں مل جائے گا پھر ساری عمر کا ٹھیکہ تو ہم نے لیا ہوا نہیں ہے جو اس کو صبح و شام کھانا کھلاتے رہینگے اس کے باپ نے تو جیتے جی دس روپے تک نہ دیئے تھے۔" چاچا دامودر داس خاموش بیٹھے سُن رہے تھے۔ میں چارپائی پر پڑی آنسو بہا رہی تھی۔ چاچا جی نے جواب دیا بے چاری بیوہ ہو گئی ہے۔ سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا۔ بھائی صاحب کی بھی کوئی جائداد نہیں جس کی بدولت یہ اپنی زندگی گذار سکے۔ آخر ہمارے خاندان کی لاج ہے۔ اس کو سنبھالنا تو ہمارا فرض ہے۔

"ہاں ٹھیک ہے اس کی لاج بچانا ہمارا فرض ہے اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اس کا کچھ وواہ کر دو۔ بے چاری کی زندگی سُدھر جائے گی اور ہمارا بھی بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"پُنر وِواہ کر تو دوں۔ لیکن کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا جو اس طرح زمانے کی ٹھکرائی ہوئی عورت کو اپنانے کے لئے تیّار ہو"۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں"، چاچی نے جھٹ سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ میرے بھائی کا لڑکا رام کشن جو ہے۔ وہ بھی تو رنڈوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِن دونوں کا ساتھ اچھا رہے گا"۔

"بہت اچھّا صُبح رام کشن سے بات کرنا۔ اگر وہ مان جائے تو پھر میں منورما کو سمجھاؤں گا"۔

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟" راجندر نے دبی زبان میں کہا۔

"پھر کیا ہوا۔ مجھے رات بھر نیند نہ آئی۔ طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں چکّر لگاتے رہے۔ کبھی ہاں اور کبھی نہ آخر کار مجبوریوں کا نقشہ گھومنے لگا اور میرا زاویہ ہاں پر جاکر ختم ہوا۔ میں سو گئی۔ صبح ہوئی حسب معمول گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ آج چاچی کا وطیرہ کچھ اچھّا تھا وہ جلد ہی باہر چلی گئی۔ میں نے کھانا تیار کیا۔ چاچا چی کھانے پر بیٹھے مجھے بھی پاس ہی بُلا لیا اور کہنے لگے۔

"بیٹی زمانہ بہت نازک ہے۔ نوجوان حُسن پر سیاہی کے دھبّے ڈال دیا کرتے ہیں جس سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اور سماج سے گھبرا کر موت پیاری لگتی ہے۔ تم بھی نوجوان ہو گرہستی کا جیون تم نے چند دن بھی نہیں گذارا۔ عورت کی زندگی کو سہارے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اگر ایک سہارا چھُوٹ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام عمر بے سہا ہی کاٹ دی جائے۔

"میں خاموش نصیحت سن رہی تھی ——"

"ہم بھی تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں" چاچا جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کب تک تمہارا ساتھ دینگے۔ اس لئے اگر بُرا نہ مانو تو کہوں"۔

میں نے کہا۔ "اب میرا دُنیا میں ہے ہی کون چاچا جی"۔

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ تمہیں جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ آجکل پُنر وواہ میں کوئی دوش نہیں اور پھر سماج سدھار ہے یہ تمہاری چاچی کے بھائی کا لڑکا رام کشن رنڈوا ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو اُس سے پُوچھ لیں"۔

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"میری خاموشی کو اُنھوں نے رضامندی سمجھا"۔

"چاچی صُبح سے ہی غائب تھی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جونہی چاچا جی باہر جانے لگے چاچی بھی آگئی وہ پھر وہاں ہی بیٹھ گئے"۔

"گئی تھی رام کشن کے پاس" چاچی نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی منت سماجت کی۔ آخر اُس نے تو ہاں کر دی۔ اب دیکھتی ہوں کہ تمہاری لاڈلی بھتیجی کیا جواب دیتی ہے"۔

"کیا جواب دے گی۔ وہ تو گئو ہے۔ جہاں باندھ دیا وہیں کھڑی ہو گئی۔ چاچا جی نے کہا۔

"تو آپ نے اُس سے بات کر لی؟"

"ہاں کر لی، وہ بھی تو سب کچھ جانتی ہے"۔

"رام کرشن کو میں بُلا آئی ہوں۔ شام کو آئیگا۔ آپ بھی جلدی آجانا"۔

"راجندر! جیسے جیسے وقت گذرتا گیا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی

کبھی خیال آتا تھا کہ بھاگ جاؤں۔ لیکن جاؤں کہاں؟ عورت ہوں عورت کی کمزوری سے شریف سے شریف بھی ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر طریقہ سے اُس کی زندگی کو برباد کر دینے کے لئے محبت کے کھیل کھیلتا ہے۔ اور پھر ٹھکانا بھی تو کوئی نہیں اِسی اُلجھن میں شام ہوگئی۔ پھر چاچی نے اندر آکر مجھے بتایا کہ رام کرشن باہر آیا ہوا ہے صاف سُتھرے کپڑے پہن لو۔ چنانچہ میں نے دُھلی ہوئی سفید دھوتی زیب تن کی اور نیچی نظریں کئے ہوئے چاچی کے ہمراہ چل پڑی۔

رام کرشن ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص تھا۔ آنکھوں میں شرافت نام کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ جب میں اُس کے سامنے گئی تو وہ بلا جھجک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے پاس آکر چہرہ کو اُوپر اُٹھا کر کہنے لگا۔

چاچی! واقعی آپ نے میرے لئے ایک انمول اور لاجواب ساتھی ڈھونڈا ہے مجھے کوئی انکار نہیں۔ جس دن آپ مناسب سمجھیں رسم ادا کر لیں۔ اگر کہیں تو آج ہی میں اس کو ساتھ لئے جاتا ہوں۔

میں حیران کھڑی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

"چاچی نے کہا رام کرشن! دو چار دن انتظار کرو۔ پنڈت سے مہورت نکلوا کر رسم و رواج کے مطابق تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔"

رام کرشن جتنی دیر بیٹھا رہا، چاچی سے باتیں کرتا رہا اور اپنی تعریف کے پُل باندھتا رہا لیکن آنکھوں سے میرے حُسن کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد میں تو کمرہ سے چلی گئی۔ چاچی اور رام کرشن نمعلوم آپس میں کیا کیا کھچڑی پکاتے رہے۔ کافی رات گئے رام کرشن وہاں سے گیا۔

"بھگوان جانے راجندر! مجھے رام کرشن سے نفرت کیوں ہوگئی۔ اُس سے مجھ

کیوں ڈر لگ رہا تھا۔ دِل کانپتا تھا۔ لیکن بے بس کیا زور؟ تین چار ہی دن گذرے تھے کہ چاچی نے پنڈت کو بُلا بھیجا۔ اور مجھے نئے کپڑے پہننے کو دیئے۔ اتنے میں رام کرشن بھی ایک خوبصورت پوشاک پہنے عجیب شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ پنڈت نے منتر پڑھے اور چاچی نے میرا دوپٹہ رام کرشن کے رُومال کے ساتھ باندھ دیا۔

"رام کرشن کا مکان اس میں شک نہیں ایک عالیشان عمارت تھی اور اس میں صرف وہی اکیلا رہتا تھا۔ اُس کے والدین مدت ہوئی اُس کی حرکات سے تنگ آکر راہیِ ملک عدم ہو چکے تھے۔ اُس کی پہلی دو عورتیں مر چکی تھیں۔ اب میں تھی تیسری جس کو اُس نے اپنے جال میں پھنسایا تھا۔ پہلے ہی روز وہ میرے لیے کئی ایک چیزیں بازار سے خرید کے لے آیا۔ جس میں ایک سنگار میکس۔ بنارسی ساڑھیاں تین چار قسم کے سینڈل بھی تھے میں خوش تو ہوئی۔ لیکن میرے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہوتی گئی۔ وہ میرے ایک اشارے پر سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہو جاتا۔ دِن میں مجھے تین تین چار چار بار رنگ برنگی ساڑھیاں پہنا کر اور طرح طرح کے فیشن ایبل بنوا کر خوش ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ واقعی زندگی کا لُطف اب ہی نصیب ہوگا۔ لیکن یہ کھیل صرف چند دِن کا ہی تھا۔ ایک رات جب میں کھانا کھا کر پلنگ پر دراز تھی اور کتاب پڑھ رہی تھی کہ رام کشن شراب کے نشہ میں مخمور ایک اور نوجوان کو ساتھ لیے کمرہ میں داخل ہوا۔ میں چونک پڑی اور اُٹھ بیٹھی۔ رام کرشن میرے پاس آگیا اور وہ نوجوان بھی، نوجوان کی آنکھیں میرے حُسن پر تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔

رام کرشن نے کہا۔ ہے نہ لاکھوں میں ایک۔

نوجوان نے ایک آہ بھری اور ایک سو روپیہ کا نوٹ رام کرشن کے ہاتھ میں دے دیا

رام کرشن نے پچیس روپیہ اور مانگے اور وہ بھی نوجوان نے بخوشی دے دیئے۔ میں تماشہ ایک تماشائی کی طرح دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ رام کرشن روپیہ لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مجھے کہنے لگا، یہ میرا دوست ہے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ میں خوفزدہ تھی کہ کیا جواب دوں۔

رام کرشن کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا۔ میں خاموش کھڑی دیکھ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ ابلا کی لاج تیرے ہاتھ ہے بچالے یا ہمیشہ کیلئے مٹادے۔

نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑا اور پلنگ پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ میں اُس سے ہاتھ چھڑا کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اُسے غصہ آگیا۔ کہنے لگا۔ یہ کیا مخول ہے۔ میں نے ایک سو پچیس روپے دیئے ہیں چنانچہ مجھے اُس وقت معلوم ہوا کہ میری عصمت کا سودا ہو رہا ہے۔ اب عزت بچانے کا سوال ہے۔ میں نے بناوٹی ہنسی سے کہا۔ اچھا جی! یہ بات ہے؟

راجندر نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور کہنے لگا پھر کیا ہوا۔ (اسکا رنگ زرد ہو رہا تھا)

"میں اس کے پاس چلی گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا کہ شراب تو آپ لائے نہیں مجھے تو اسکی عادت ہے۔ اُس نے فوراً بیس روپے نکالے اور کہنے لگا۔ رام کرشن کو کہو کہ وہ ابھی لے آئے۔ اس پر میں نے کہا کہ تم نہیں جانتے پولیس والے اردگرد چکر لگاتے رہتے ہیں کہیں اور ہی مصیبت نہ بن جائے۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں چنانچہ میں دوسرے دروازہ سے نکلی تب میری جان میں جان آئی۔ وہاں سے سٹیشن پر پہنچ کر لاہور کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سوار تو ہو گئی تھی لیکن لاہور سے بالکل ناواقف تھی بچپن میں ایک دفعہ

پتاجی کے ساتھ ہردوار جاتے ہوئے لاہور اُتری تھی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ لاہور ایک بہت بڑا شہر ہے جہاں شرافت کی زندگی گذارنے میں مجھے کوئی دقّت پیش نہ آئے گی پلیٹ فارم پر اُتری۔ تھی اکیلی، ناواقف اور بغیر سامان کے۔ ایک پولیس کانسٹیبل میرے پیچھے پیچھے ہولیا۔ مجھے ڈر لگا۔ چنانچہ میں جس طرف لوگ جارہے تھے اُن کے پیچھے ہولی اور جب ٹکٹ دے کر باہر نکلی تو کانسٹیبل نے پوچھا۔ کہاں جاؤ گی؟

میں نے جواب دیا۔ "یہاں لاہور میں"۔

"کس کے یہاں اور کس گلی میں؟"

"میں نہ تو گلی کا نام جانتی تھی۔ نہ محلّے کا۔ اِس لئے تیزی سے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے آگے نکل گئی اور ایک بڑھیا کے ساتھ ساتھ ہولی۔ چند قدم وہ سپاہی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن جب میں اُس بڑھیا کے ساتھ تانگہ میں سوار ہو گئی تو وہ واپس چلا گیا۔

تانگہ میں بڑھیا نے پوچھا بیٹی! کہاں رہتی ہو ــــــ"

"ماں میرا اِس شہر میں کوئی جان پہچان والا نہیں قسمت کی ٹھوکر مجھے یہاں لے آئی"۔

"کیا مطلب؟ تمہارا اس شہر میں کوئی رشتہ دار نہیں؟"

"جی کوئی نہیں۔"

"تو کہاں رہو گی؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا"۔

اچھا تو میرے ساتھ چلو۔ میرے گھر رہو۔ جب تمہارا کوئی انتظام ہو جائے چلے جانا۔

میں نے بھگوان کا شکر کیا اور بوڑھی ماں کے ساتھ انارکلی کے اڈّہ پر اُتر گئی چند ایک گلیوں میں سے گھوم کر ہم دونوں ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئیں۔ مکان کا دروازہ

گھلا ہوا تھا لیکن گھر میں کوئی نہ تھا۔ گھر میں سامان بھی کوئی خاص نہ تھا جسکو کوئی چرا کر چند روپے اکٹھے کر سکتا۔ بوڑھی ماں نے اپنی گٹھری رکھی اور مجھے چارپائی پر بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں نے مکان کی حالت دیکھی۔ سامان کی بے ترتیبی۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں نے اندازہ لگایا کہ گھر میں بوڑھی ماں کے سوائے اور کوئی عورت نہیں ہے۔ میں اٹھی اور جھاڑو لے کر گھر کی صفائی کرنے لگی۔ ماں نے منع بھی کیا۔ لیکن میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اتنے میں ایک نوجوان لیکن نابینا شخص مکان میں داخل ہوا اور بولا۔

"ماں تم آگئیں"۔ میں تو سٹیشن پر لینے گیا تھا۔ کچھ دیر سے پہنچا۔

"ہاں بیٹا! آگئی"

"اس نوجوان کا نام کمل تھا۔ جو کہ ایک میوزک ماسٹر تھا۔ اس کے بعد ماں نے کھانا تیار کیا۔ میں نے اور کمل نے کھایا۔ شام کے چار بجے چھوٹے چھوٹے لڑکے آنے شروع ہو گئے۔ بیس پچیس کے قریب ہونگے۔ کمل نے اپنی پیٹی اور طبلہ نکالا اور بیٹھ گیا۔ اُس وقت میں نے سمجھا کہ یہ گانے کا سکول ہے۔ کمل کی آواز میں درد تھا۔ مٹھاس تھی اور سوز۔ دو گھنٹے یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر لڑکے چلے گئے۔ کمل نے میرے متعلق ماں سے پوچھا۔ اُس نے صرف اتنا کہا کہ بے چاری مصیبت زدہ ہے۔ کوئی آسرا نہیں اس کا۔ چند دن رہے گی اپنی قسمت کا کھائے گی جب ٹھکانہ مل جائے گا چلی جائے گی۔

نہیں نہیں ماں جب تک اس کا دل چاہے رہے۔ نہیں بھی تو کوئی باتیں کرنے والا چاہیئے تھا۔ بھگوان نے اس کو بھیجا ہے۔

اب میں وہاں رہنے لگی۔ کمل کی آواز میں جادو تھا میں اس کا گانا سُنکر میں جھوم جاتی مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی گانا سیکھوں۔ چنانچہ میں نے کمل سے کہہ دیا۔ وہ ایک ماسٹر

تھا۔ اُس نے بخوشی ہاں کر دی۔ راجندر! یہ بتانا میں بھول گئی۔ کہ میرے آنے کے چند دن بعد گانا سیکھنے والوں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ اور جب کبھی بھی کوئی بات ہوتی تو ماں یہی کہا کرتی کہ لکشمی ہمارے گھر آئی ہے۔

اب میں گانا سکھلانے میں کمل کا ساتھ دیتی۔ مجھے بھی ایک چوٹ لگی تھی۔ دل میں ایک درد تھا۔ آواز میں سوز تھا۔ کمل میرے گانے پر جھوم جاتا میں اس چھوٹی سی دُنیا میں بہت خوش رہنے لگی۔

راجندر جسکی قسمت میں در در کی ٹھوکریں لکھی ہوں۔ بدقسمتی جس کا دامن سنبھالے ہوئے ہو۔ اُسکو سُکھ شانتی کہاں؟ ایک دِن ماں کے ساتھ کمل کے لئے کپڑے خریدنے بازار گئی۔ کراچی کلاتھ ہاؤس پر کپڑے پسند کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رام کرشن وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا فوراً دوکان سے نیچے اُتر گیا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ کہیں رام کرشن زبردستی نہ کرے۔ میں نے ماں کو فوراً گھر چلنے کو کہا۔ اور پیٹ میں سخت درد کا ہونا ظاہر کیا۔ ماں فوراً دوکان سے نیچے اُتر آئی۔ میں چاروں طرف دیکھتی دیکھتی لوہاری دروازہ کے اندر چلی آئی۔ مجھے رام کرشن نظر نہ آیا۔ گھر پہنچی تو دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں ہر گھڑی دروازہ کی طرف لگی رہتیں۔ اُس رات میں نے کھانا بھی نہ کھایا۔ اور نہ ہی نیند بھر سوئی۔ مکان کے باہر جانا بند کر دیا۔ اب چار دیواری کے اندر قید تھی۔ اِدھر نئی مصیبت اور آگئی کہ کمل کو بُخار ہو گیا۔ لڑکوں کو گانا بھی میں ہی سکھلایا کرتی۔ کمل چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا بخار دن بدن تیز ہوتا گیا۔ مجھے اور بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں کمل کو کچھ ہو گیا۔ تو بوڑھی ماں کیا کہے گی ناگن کا خطاب تو مجھے مل ہی چکا تھا۔

میں نے دِل سے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ ایک رات جبکہ

بوڑھی ماں اور کمل عالمِ خواب میں مست ہو رہے تھے۔ میں مکان سے نکل کھڑی ہوئی سیدھی انارکلی آئی۔ ٹانگہ میں سوار ہو کر اسٹیشن پہنچ گئی۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ میں نے دہلی کا ٹکٹ خریدا اور چپکے سے جا کر پلیٹ فارم پر ایک کونہ میں بیٹھ گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب میری پوشاک زرق برق نہ تھی۔ ایک معمولی گھرانے کی عورت دکھائی دیتی تھی۔ میری آنکھیں ہر ایک آنے جانے والے پر اُٹھ جاتیں۔ کہ کہیں رام کرشن نہ آجائے۔ آخر گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی اور میں جلدی جلدی زنانہ کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں اپنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی ساتھ لے آئی تھی۔ میرے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان عورت خوبصورت ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ میری خوبصورتی جوانی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"کہاں جاؤ گی؟"

"دہلی۔"

"کس کے ہاں؟"

"کیا بتاؤں بہن میرا دُنیا میں کوئی نہیں بے آسرا ہوں ٹھوکریں کھا رہی ہوں کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔"

"دہلی میں پہلے بھی گئی ہو؟"

"نہیں تو۔ پہلی دفعہ ہی جا رہی ہوں۔"

"تمہیں دہلی میں تکلیف تو بہت ہوگی۔ اکیلی عورت کا چلنا پھرنا۔ رہنا سہنا بیٹھنا۔ اُٹھنا۔ خالی از خطرہ نہیں۔ اور پھر تم تو نوجوان ہو خوبصورت ہو۔"

"تو کہاں جاؤں بہن ہردوار چلی جاؤں۔"

"ہردوار میں بھی تو مرد ہی رہتے ہیں۔ عورتیں نہیں۔"

"تو آپ ہی بتائیں کہ کہاں جاؤں؟"

آپ میرے پاس رہیں۔ ہر طرح کا آرام رہے گا۔ خرچہ میں برداشت کروں گی۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی بلا رضامندی نہ دیکھ سکے گا"۔

"آپ وہاں کیا کام کرتی ہیں؟"

"کام خود چل کر دیکھ لینا۔ ایک بات ضرور ہے بے فکری سے زندگی گذر رہی ہے"۔

"دل میں میں نے کہا۔ چل یہ بھی دیکھ۔ عورت ہے مرد نہیں جو تیری آبرو لوٹے گا"۔

میں نے کہا۔ اچھا تو بہن۔ تمہارے ہی ہاں زندگی کے باقی دن گذار لوں گی۔ گھر کا کام کاج کر دیا کروں گی۔ صرف کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا دے دینا۔ میں گانا بھی جانتی ہوں گانے کا سکول جاری کر دینا۔ میں گانا سکھایا کروں گی جس سے گھر کا خرچہ پورا ہو جایا کریگا"

وہ ہنسی۔ "آپ گانا بھی جانتی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے"۔

"اس سے مطلب؟"

"میں خود بھی گاتی ہوں۔ گانے کی آمدنی پر تو عیش و آرام کی زندگی گذر رہی ہے"

"میں بہت خوش تھی کہ ساتھی ملی تو عورت اور وہ بھی گانے والی۔ گاڑی جالندھر پہنچی۔ اس نے کھانا منگوالیا۔ مجھے بھی دیا اور خود بھی کھایا۔

"کھانا کھانے کے بعد اس نے میرا حسب نسب پوچھا۔ میں نے بلا حیل و حجت اپنی گذری ہوئی زندگی کی داستان سنادی۔ وہ کہنے لگی"۔

"عورت کو کمزور دل نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک کیا دس مرد بھی عورت کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ بشرطیکہ وہ باحوصلہ اور استری چرتر میں ماہر ہو"۔

"وہ کس طرح؟"

"پتھر سے پتھر دل شریف اور بدمعاش سے بدمعاش مرد بھی عورت کی ترچھی نظر کا شکار ہو کر بے دام غلام ہو جاتا ہے۔ عورت جس طرح چاہے اُس کو نچا سکتی ہے۔ عورت کو اپنا دِل پتھر کی طرح سخت کرنا ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے کوئی محبّت کا واسطہ دے خوشی کا خون دلائے۔ دھن دولت کے سبز باغ دکھائے اُسے اپنی عصمت کی حفاظت کیلئے سب کو ٹھوکر لگانی ہوتی ہے"۔

"میں نے کہا عورت تو ایک کمزور دِل ہوتی ہے۔ اس کا دِل موم کی طرح نرم ہوتا ہے ذرا سی گرمی سے پگھل جاتا ہے۔ مردوں کی محبّت کے خوشنما گلشن کو دیکھ کر وہ مست کوئل کی طرح جھوم اُٹھتی ہے۔ وہ اِس طرح کٹھور کیسے ہو سکتی ہے۔ آخر اس میں بھی تو ہوس ہے"۔

"ہاں۔ مرد سے کئی گنا زیادہ۔ لیکن جس طرح ایک سادھو دُنیا میں رہتا ہوا بھی دُنیا سے الگ رہتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکدامن عورت عیش و عشرت کی محفل میں رہتے ہوئے بھی اپنی عصمت کو بچائے رکھتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بناوٹی ہنسی۔ مصنوعی محبّت اور شاطرانہ گفتگو ہوتی ہے۔ جس سے کہ سُننے والا یہ سمجھے کہ دِل و جان سے فریفتہ ہے"۔

"اُس کی باتیں سُنکر میرا دل بھی کچھ سخت ہو رہا تھا۔ میں نے پُوچھا۔ آپ کا نام؟"

"شیاما ——"

گاڑی دہلی پہنچی۔ اُس نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور ایک کُشادہ سڑک سے ہوتی ہوئی چند ایک سڑکوں پر گھُوم کر ایک عالی شان بلڈنگ کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ یہ وہی بلڈنگ تھی راجندر جہاں تم مجھ سے ملے تھے۔

راجندر ایک پتھر کا مجسّمہ بنا بیٹھا سُن رہا تھا۔ نہ اُس کی زبان سے ہُوں ہاں نکلتی تھی اور نہ ہی اُس نے کہا پھر کیا۔

"شیاما نے راجندر کو بازوؤں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا سو گئے ہو ــــــ؟"

نہیں سو تو نہیں گیا تھا راجندر نے جواب دیا۔ خیالات کا بوجھ ہی کچھ ایسا دماغ پر آ پڑا کہ سُدھ بُدھ بھول گیا۔ اچھا تو آگے؟

اس کے ساتھ میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئی جس میں خوبصورت صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ رنگ برنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ اور ایک کونے میں گانے بجانے کا تمام ساز و سامان پڑا ہوا تھا۔ سارنگی، طبلہ، ہارمونیم مردنگ اور نہ جانے کیا کیا ساز تھے۔ مجھے شک تو گذرا کہ ہو نہ ہو یہ گانے والی ویشیا ہے لیکن پھر زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

شام ہوئی۔ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ مجھے ایک علیحدہ کمرہ میں رکھا ہوا تھا۔ گانے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ واقعی وہ ایک سُریلا گانے والی تھی۔ ساتھ ناچنے اور واہ واہ کی آواز بھی سُنا دی۔ مجھے اس وقت یقین ہو گیا کہ شیاما ایک گانے والی ویشیا ہے۔ دِل نے بھاگ جانے کی صلاح دی۔ اور اُس کمرہ سے دروازہ تک آ بھی گئی۔ لیکن رُک گئی۔ گانا ختم ہوا۔ لوگ کمرہ سے باہر نکل گئے۔ عمدہ کھانا بنا ہوا تھا۔ شیاما کے ساتھ کھانے کو بیٹھی۔ میں نے کہا۔

شیاما! مجھے اس زندگی سے نفرت ہے۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ میں ایسی زندگی سے موت کو پیار کرتی۔ تُو میرے حال پر اتنا رحم کر کہ مجھے یہاں سے چھٹکارا دے دے۔

وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ لگی چھٹکارا تو دے دوں لیکن منورما یہ دہلی ہے۔ دہلی۔ جہاں شریف سے شریف گھرانوں کی عصمت سرِ بازار لُوٹی جاتی ہے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس شرافت کے ٹھیکیدار رہتے ہیں جن کے ہاتھوں کسی کی آبرو نہیں بچ سکتی۔ تُو اکیلی ایک دن بھی نہیں کاٹ

سکے گی۔ ایک کوڑی کی ہو جائے گی منورما۔ تیری جوانی کو دن کی روشنی میں لوٹ لیا جائے گا پھر ٹھوکریں کھائے گی۔ در در بھیک مانگے گی۔ لیکن وہ بھی کوئی نہ دے گا۔ بلکہ بھیک دینے کے بہانے تیری عصمت کا سودا کیا جائے گا۔ یہ بازار حُسن ہے۔ لیکن عورت کے اختیار میں ہے اگر وہ نہ چاہے تو لاکھ روپے میں بھی اپنی آبرو فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

میں خاموش ہو گئی۔ دوسری شام محفل گرم ہوئی۔ شیاما نے مجھے بھی ایک خوبصورت ساڑھی دی اور محفل میں لے گئی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے گایا۔ سُننے والوں کو لُطف تو ضرور آیا لیکن وہ نزاکت کہاں جو شیاما میں تھی۔ آخر دن گذرتے گئے اور میں بھی اسی ماحول میں ایک جان ہو گئی۔

شیاما ایک رات نمعلوم کہاں غائب ہو گئی جس کا پتہ آج تک کسی کو نہ لگا۔ مجھ میں بھی اب ناز و نخرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن راجندر آپ مانیں یا نہ مانیں میں نے سوائے گانے کے اور کسی سے سروکار نہ رکھا۔ آخر ایک شام آپ وہاں آئے۔ آپ کی آنکھوں میں شرافت چھپی ہوئی تھی۔ میرا دل بے قابو ہو گیا۔ بس آگے جو ہوا، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔

یہ ہے میری داستان۔ اب آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں

راجندر پھر بھی خاموش بیٹھا رہا۔

منورما کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

راجندر تم نے بھی مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میری داستان میری موت ہو گی

راجندر جیسے سوتے ہوئے جاگا ہو۔ تین تین بار میری تمناؤں کی مرکز۔ میری زندگی۔ تم میری رہو گی ــــ ہمیشہ ــــ ہمیشہ ــــ اور بے اختیار منورما کے گلے سے چمٹ گیا۔

ستاروں کے سائے

مدن نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ جونہی اُس نے ٹکٹ چیکر کو کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اِس سے پہلے تین چار کمپارٹمنٹوں سے جان بچا کر آیا تھا لیکن اب سوائے چھلانگ لگانے کوئی چارہ نہ تھا۔ ٹکٹ کلکٹر جونہی گاڑی جہلم سے روانہ ہوئی۔ مدن کا پیچھا کیے ہوئے تھا۔ مدن گرا تو ضرور۔ اُسکو چوٹ بھی ضرور آنی چاہیئے تھی۔ لیکن خوش بختی سے۔ وہاں مٹی کے انبار لگے تھے۔ وہ گرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی وہ نہ رُکی۔ اسے کیا۔ اگر ایک نہیں دس مُسافر بھی چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیں۔ ٹکٹ چیکر کو شک تو گذرا اور چند مسافروں نے بھی کچھ گرتے دیکھا۔ لیکن گاڑی کو روکنا اُن کے اختیار سے باہر تھا۔ یہ شخص کو ڈر تھا کہ کہیں مجرمانہ ہی نہ ہو جائے۔ اوپھڑ دوسرے خواہ مخواہ وہ ٹانگ کیوں اڑاتے۔ چند منٹ کچھ آدمیوں کی زبان پر اس بات کا تذکرہ رہا۔ کہ معلوم نہیں کیا گرا ہے۔ کسی صاحب کا سامان تھا۔ یا کوئی فٹ بورڈ پر بیٹھا ہوا مسافر ——

مدن ایک گھنٹہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ اخر اُسے ہوش آیا۔ اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ وہ پھر وہاں ہی لیٹ گیا۔ ابھی رات باقی تھی چند گھنٹے گذرنے کے بعد صبح نے اپنی نورانی صورت دکھائی مدن نے بھی اُٹھنے کی ہمت کی۔ اور آہستہ آہستہ چلکر نزدیک ہی کھیتوں میں ایک کنواں تھا۔ وہاں جا پہنچا۔ درخت کے نیچے جاکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کچھ لڑکیاں پانی بھرنے کیلئے آئیں۔ اونھوں نے ایک اجنبی کو کنوئیں پر دیکھا۔ ایک نے کہا۔

"یہ صبح صبح کون کنوئیں پر آکر بیٹھ گیا۔"

"کوئی مسافر ہوگا۔ تھک گیا ہے بیچارہ"

"ہمیں کیا۔ پانی بھرو اور چلو"۔

"جمنا سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگی۔ پوچھ تو لینا چاہیئے کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ اور کہاں جائے گا"۔

تمہیں تو گاؤں کا چوکیدار ہونا چاہیئے تھا۔ بن گئی ہو، نمبردار کی بیٹا۔

"اس میں ہرج بھی کیا ہے"۔

"کوئی ہرج نہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ پوچھ لو۔ جو دل چاہتا ہے۔ پوچھ لو"۔

کہاں جاؤ گے؟ ——— ؟"

"جاؤں گا۔ تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد چلا جاؤں گا"۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ٹانگوں میں کوئی چوٹ آئی ہے"۔

"ہاں گاڑی سے گر گیا تھا۔ رات بھر وہاں پڑا رہا ہوں"۔

"پانی کی پیاس نے تنگ کیا تو کنوئیں پر آگیا ———"

"تو پانی پیجیے ماں"

"آپ کی مہربانی"۔ جمنا نے مدن کو پانی پلا دیا۔

"گاؤں میں چلے چلو۔ ایک مندر ہے وہاں مسافر ٹھہرا کرتے ہیں کچھ"۔

"مجھ سے تو ابھی اچھی طرح چلا بھی نہیں جاتا"۔

"سب لڑکیاں کھڑی ہنس رہی تھیں۔ نوجوان ہے۔ کہتا ہے چلا نہیں جاتا ٹانگیں تو بھلی چنگی دکھائی دیتی ہیں"۔

"جمنا۔ تو بھی پاگل ہو گئی ہے۔ چلو چلیں اب دیر ہو رہی ہے"۔

"انسان کی سیوا کرنا انسان کا پرم دھرم ہے"۔

تم ٹانگیں دباؤ بیٹھ کر۔ ہم تو چلیں۔ ہمیں تو گھر سے غصے ہوتے ہیں۔

جمنا گاؤں کے مکھیا کی بیٹی تھی۔ نوجوانی میں ابھی قدم رکھا تھا چہرہ پر خوبصورتی نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا تھا۔ جوانی میں جوبن کس نہیں آتا۔ کون عقل و حواس نہیں کھو بیٹھتا۔ کون غلطی نہیں کرتا۔ بچپن کا کھیل ختم ہوتے ہی جوانی کی ہوا سے دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مداری کا کرشمہ ہے اور ازل سے جاری ہے۔

جمنا نے بھی اس خوبصورت جوان کو دیکھا تھا۔ اس کے دل نے بھی کروٹ لی اور آنکھوں میں پریم نے اپنا کاجل ڈالا تھا۔

جمنا نے پھر کہا اٹھو بابو ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں مندر میں پہنچا دینگی۔

مدن اٹھ کر کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جمنا نے پانی کا گھڑا تو اٹھا لیا لیکن اس کا خیال مدن کی طرف ہی تھا۔ اور چند قدم چلنے کے بعد پھر پیچھے دیکھ لیتی تھی۔

مدن گاؤں میں پہنچ گیا۔ اور مندر کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کا منہ چھوٹا سا۔

ایک سنیاسی اُس میں رہتا تھا۔ اُس کی عمر ہو گی ساٹھ سال سے اُوپر۔ گاؤں کے لوگ فصل تیار ہونے پر سال بھر کے لئے اناج سادھو بابا کو دے دیا کرتے تھے۔

"آؤ بیٹا۔" اوم نمو نارائن۔ کہاں سے آئے ہو ــــــ"

"مہاراج راولپنڈی سے ــــــ"

"کہاں جاؤ گے ــــــــــــ"؟

"جہاں آب و دانہ لے جائے ــــــ"

"گھر سے روٹھ کر آئے ہو ــــــ"

"نہیں مہاراج روٹھ کر نہیں۔ بھائی نے گھر سے نکال دیا ہے ــــــ"

"کوئی شرارت کی ہو گی ــــــ"

"کچھ نہیں مہاراج۔ باپ سیر سٹر تھا۔ کافی جائیداد کا مالک۔ میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ ماں باپ کا سُرگباش ہو گیا تھا باپ کی سیوا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پتاجی نے اسلئے میرے بڑے بھائی کنول سین کی شادی کر دی۔ اس وقت اس نے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی پاس کیا تھا شادی ہو جانے کے بعد باپ کی سیوا تو درکنار کھانا بھی گھر سے اچھا نہ ملتا تھا آخر وہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ بھائی وکیل ہو گیا۔ اس کی آمدنی بھی معقول ہو گئی بھابی جس کو میں بھابی کہا کرتا تھا مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ میں بھی بازار کا سب کام کر دیا کرتا تھا میں نے میٹرک پاس کیا تو بھائی نے کالج کی پڑھائی بند کر دی۔ اور کہنے لگے کہ نوکری کرو اور اپنا خرچ چلاؤ۔ مجھے نوکری نہ ملی۔ صبح سے لے کر شام تک پاپیادہ سڑکوں کے چکر کاٹتا اور جب چل چل کر تھک جاتا۔ تو گھر واپس آتا۔ بھابی چوری مجھے کبھی کبھی ایک روپیہ دے دیتی۔

بھائی نے کئی دفعہ مجھے مارا بھی۔ لیکن پھر بھی میں نے پرواہ نہ کی یہی سوچتا تھا کہ میری بھلائی کے لئے ہی کیا جا رہا ہے۔ ایک دن میں دوسرے کمرے میں چارپائی پر لیٹا تھا بھابی صاحب نے میرے متعلق پوچھا اور جب بھابی نے انہیں بتایا کہ مدن تو بازار گیا ہے۔ تو کہنے لگے۔

"میں مدن کو حوالات پہنچا کر ہی دم لونگا۔ نہیں تو یہ کبھی نہ کبھی اپنا حصّہ مانگے گا"۔

بھابی نے بہت سمجھایا مگر بھائی صاحب ضد پر قائم رہے انھوں نے یہاں تک کہہ دیا۔ کہ پولیس اسپکٹر سے کہہ دیا ہے کہ اب جو چوری اس محلہ میں ہوگی اس میں مدن کو بھی گرفتار کر لینا۔

میں نے جب یہ الفاظ بھائی کی زبان سے سُنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی حواس باختہ ہو گئے۔ میں قید ہو جاؤں گا بلا کسی تصور کے میرا دل خوف سے کانپنے لگ گیا۔ اور میں چپکے سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا اسٹیشن پہنچکر گاڑی پر بلا ٹکٹ ہی سوار ہو گیا۔ جہلم تک تو بخیریت پہونچ گیا۔ لیکن وہاں سے ٹکٹ چیکر میرے پیچھے پڑ گیا جب میں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی۔ اور یہ سوچا کہ بلا ٹکٹ ہونے کی وجہ سے گرفتار ہو جاؤں گا تو میں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔

باوا سمیر گر نے ایک سرد آہ بھری۔ گرہست بھی ایک مصیبت ہے۔ دولت بھی ایک دھوکا ہے۔ کوئی فکر نہ کرو۔ بیٹا۔ بھگوان شنکر تمہاری سہائتا کرینگے۔ چلو منہ ہاتھ دھو لو اور بھگوان کی آرتی اُتار لو۔

مدن نے ہاتھ پاؤں صاف کئے۔ اور مندر میں گیا۔ بھگوان شنکر کی وشال مورتی کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بھگوان میں نے کوئی اپرادھ تو نہیں کیا۔ پھر یہ سزا کیوں، یہ در در کی ٹھوکریں کیوں تم تو میرے دل کا حال جانتے ہو۔ بھگوان مجھ نردوش کی رکھشا کرو۔ رکھشا کرو بھگوان۔"

باوا سمیر گر نے آرتی سماپت کی ــــــــــ

"بیٹا یہ بھگوان کا گھر ہے۔ یہاں سے تمہیں کوئی نہیں نکال سکتا۔ جب تک چاہو رہو کھانے کیلئے بھنڈار بھرے ہیں۔"

مہاراج میں بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ چلا جاؤں گا۔ چند دنوں کے بعد جب ٹانگوں میں ذرا سی چلنے پھرنے کی طاقت آجائے گی ــــ"

اچھا چلے جانا بیٹا۔ جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔"

باوا سمیر گر نے کھانا تیار کیا۔ اتنے میں جمنا دال برتن میں لے آگئی۔

کیسے بھول سکتی ہوں مہاراج آج تو ایک اور مورتی بھی ہے۔ اسی لئے تو دو آدمیوں کے لئے زیادہ دال لائی ہوں ــــ"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا بیٹا ــــ؟"

"میں نے ہی تو اس کو مندر کا راستہ بتایا تھا ــــ"

"بہت اچھا کیا ــــ"

جمنا ہر روز مندر میں آتی۔ اور باوا سمیر گر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کافی دیر تک کرتی رہتی۔ کبھی کبھار مدن کو بھی دیکھ لیتی۔ مدن نے شہر میں پرورش پائی تھی۔ سکول میں پڑھا تھا۔ اکثر اسکول کی لڑکیوں سے ہنسی مذاق بھی کرتا تھا لیکن اب وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اُسکے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونگا۔ بڑے

بھائی سے زیادہ عزت آبرو۔ دھن۔ دولت پیدا کرونگا وہ یہ دھن گاؤں میں رہ کر کس طرح پوری کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دُور بہت دُور۔ جہاں اُس کو پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں بڑے بھائی کی ہوا بھی نہ پہنچ سکے۔ جہاں چھوٹے سا چھوٹا کام کرنے میں بھی اُسے شرم محسوس نہ ہو۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ مدن مندر سے باہر کنوئیں کی طرف جا رہا تھا۔ جمنا بھی پیچھے سے گھڑا اُٹھائے آ رہی تھی۔ جونہی اُس نے مدن کو دیکھا۔ تیز قدم چل کر وہ مدن کے قریب پہنچ گئی۔

"اب تو تم چل سکتے ہو بابو۔ ——"

"ہاں۔ اب میں چلا جاؤں گا ——"

"میں نے اس لئے تو نہیں پوچھا بابو کہ تم چلے جاؤ ——"

"نہیں۔ تم نے تو یہ نہیں کہا۔ اور کسی نے بھی نہیں کہا۔ لیکن پھر بھی میں چلا جاؤنگا"

"پردیسی کو کون ٹھہرا سکتا ہے۔ بابو۔ وہ تو آتے ہیں آگ لگانے اور چلے جاتے ہیں تڑپا کر ——"

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ——"

"سمجھ کر کرو گے بھی کیا بابو۔ ——؟"

اتنے میں گاؤں کی دوسری لڑکیاں بھی پیچھے سے آ گئیں۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں جمنا ——"

"کچھ بھی تو نہیں۔ میں نے پُوچھا کب جاؤ گے۔ تو کہنے لگا۔ اب ٹانگوں میں طاقت آ گئی ہے۔ ایک دو دِن میں چلا جاؤں گا ——"

"یہاں ہی کیوں نہیں رہ جاتا ـــــ"

یہاں رہ کر کیا کرے گا۔ شہر کا بابو ہے شہر میں جی لگے ہے ایسوں کا۔"

مدن دُور نکل گیا۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ جمنا نے یہ کیوں کہا تھا کہ پردیسی آتے تڑ پالے رُلا نے ایک میل کا چکّر لگا کر جب واپس آیا تو اس وقت کنوئیں پر کوئی نہ تھا۔ مندر میں آیا۔ باوا اسمیر گر مدن کا انتظار کر رہے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے۔ بیٹا ـــــ"

"گھومنے مہاراج بیٹھے بیٹھے دِل اُداس ہو گیا تھا ـــــ"

بھگوان شنکر کا نام لیا کرو۔ نمبردار کو کہینگے کہ وہ تمہارے لئے کوئی بندوبست کر دے ـــــ"

میں یہاں رہ کر کیا کروں گا ـــــ"

چند دن اگر بھگوان کے چرنوں میں گذار لو گے تو اُس کا نام زبان سے لے لو گے تو زندگی میں بہت کام آئے گا بیٹا ـــــ"

شام کو جب نمبردار مندر میں آیا۔ تو باوا اسمیر گر نے کہا۔ نمبردار موہن لال جی مدن پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ شریف ہے اور امیر گھرانے کا ہے۔ مصیبت کے دن گذار رہا ہے۔ اگر یہاں ایک سکول کھول دیں۔ گاؤں کے لڑکے پڑھا دیا کرے گا۔ کھانا تو بھنڈارے سے کھا ہی لیتا ہے۔ اُسکی تو کوئی چنتا نہیں۔ لیکن تمام دن بیٹھا بیٹھا اُکتا جاتا ہے"

"بھلی بات کا کیا پوچھنا"۔ مہاراج۔ کل ہی اس کا بندوبست کر دوں گا۔ صبح سب گاؤں والوں کو اکٹھا کر لونگا۔ اور سب کام ہو جائے گا۔

دوسرے دن نمبردار موہن لال نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا۔ یوں بھی اُس

گاؤں کے دوکاندار لالہ لکھن کے گھر برات آئی تھی۔ نمبردار نے کہا کہ ہمارے گاؤں کے لڑکے دوسرے گاؤں میں ایک میل چل کر جاتے ہیں۔ گرمیوں کے دنوں میں دھوپ سے وہ بالکل ہو جاتے ہیں۔ کیوں نا ہم گاؤں میں ہی ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیں۔ خوشحالی سے شہر کا ایک پڑھا لکھا لڑکا گاؤں میں آگیا ہے۔ پڑھایا کرے گا۔ مندر میں وہ رہتا ہے۔ اُسکا مزید خرچہ مندر میں باوا سمیر گر کو دے دیا کرینگے۔

"نمبردار جی۔ اس میں ہم سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو سب کی بھلائی کا کام ہے ——"

"بھائی۔ صلاح مشورہ دیوار سے بھی کر لینا چاہیئے ——"

راجو جسکی عمر ابھی اٹھارہ اُنیس برس کی ہوگی۔ اُس کے باپ کو مرے چار سال ہوئے تھے وہ کافی زمین کا مالک تھا۔ گاؤں میں نمبردار سے دوسرے درجہ پر اس کا شمار تھا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ شہر کے بابو آجاتے ہیں۔ اور پھر چلے جاتے ہیں۔ مدرسہ تو کھول دینگے۔ اگر وہ چلا گیا تو پھر ——؟"

"تو پھر کیا" اور کوئی شہر سے آئینگے۔ خرچہ دینگے۔ بہت مل جائینگے"۔

راجو کو ہر کوئی ماما کہا کرتا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں یہ خطاب۔ گاؤں کے لڑکوں نے اُسے چھیڑنے کیلئے بخش دیا تھا۔ بچے رامو کو ماما رامو کہہ کر پکارتے وہ اکثر گالی گلوچ دیا کرتا اور انکے پیچھے مارنے بھاگا کرتا تھا۔ یہ لقب مشہور ہوتا گیا۔ اور گاؤں کا بوڑھا جوان راجو ماما ہی اُس کو کہا کرتا تھا۔ ایک نے کہا۔

"راجو ماما ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ دوسرے مدرسہ سے لڑکوں کو ہم لے آئینگے اگر

یہ ماسٹر بھی چلا گیا تو سب کو پریشانی ہو گی۔"

"میں اس کا سب انتظام کر لوں گا۔ یہ کام میرے پر چھوڑ دو۔"

دوسرے دن گاؤں والوں نے نمبردار کی زمین پر ایک جھونپڑہ بنا دیا۔ اور مدن نے لڑکوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔

جمنا بھی اسکول میں آجاتی اور مدن کو دیکھ کر، جی ہی جی میں بہت خوش ہوتی ہے۔

"تم بھی کچھ پڑھ لو جمنا ——"

"میں کیا کروں گی بابو پڑھ کر۔ گاؤں کی لڑکیاں نہیں پڑھا کرتیں۔"

"پڑھنے میں نقصان بھی کیا ہے ——"

"کچھ بھی نہیں پر نتو گاؤں والے کیا کہینگے ——"

"اچھا کام کرنے میں اگر بدنامی ہوتی ہے تو ہونے دو ——"

میں باپو سے پوچھ لوں ——؟"

"تمہاری مرضی۔ میں نے تو اسلئے کہا تھا کہ کم از کم خط لکھنا تو سیکھ جاؤ۔ وقت پر کام آتا ہے۔

"تو میں پڑھا کرونگی اگر باپو نے نہ بھی مانا۔ تو بھی پڑھونگی۔"

جمنا نے باپو سے پوچھا اور اُس نے ہاں کر دی۔

جمنا نے پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن اسکول میں آکر نہیں بلکہ منڈیر میں جا کر۔

ایک دن مدن ابھی اسکول سے نہ آیا تھا۔ جمنا بیٹھی ہوئی تختی پر مدن مدن لکھ رہی تھی

مدن نے تختی اُسکے ہاتھ لیکر دیکھی اور اپنا نام پڑھ کر حیران رہ گیا۔

"جمنا! تم نے تو میرا نام لکھ دیا ہے اس پر ــــــ"

"ہاں" بھول نہ جاؤں ــــــ"

لکڑی کی تختی پر لکھنے سے کیا حاصل ہے ــــ"؟

"لوحِ دل پر تو لکھا جا چکا۔ اب انگ انگ پر لکھ رہی ہوں ــــ"

"جمنا یہ راستہ بہت کٹھن ہے۔ پاؤں رکھنا بہت آسان۔ چلنا بہت مشکل، جگہ جگہ کانٹے۔ غموں کے پہاڑ۔ آنسوؤں کی بارش۔ دُکھوں کی آندھی۔ بدنامی کے نالے مصیبتوں کے طوفان۔ جُدائی کی طویل سزا ــــ"

"گاؤں کے لوگ جب کمر باندھ کر چل پڑتے ہیں تو بارش۔ آندھی یا طوفان سے نہیں ڈرتے۔ وہ اپنی منزل پر کبھی نہ کبھی پہنچ ہی دم لیتے ہیں ــــ"

"جمنا تم بہت سمجھدار ہو ــــــ"

"جی ہاں آپ سے ہی تو سیکھا کرتی ہوں"

تمہیں نے تو مجھے پریم بندھن میں باندھ رکھا ہے ــــ"

"سچ ــــــ! بالکل سچ ــــــ"

مدن اور جمنا کی خاموش محبت دن بدن گلاب کے پودے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ مدن جانتا تھا کہ یہ پودا کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پھل کے انتظار میں اُس کو سینچتا جا رہا تھا۔ دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے اور آج پورا ڈیڑھ سال مدن کو اس گاؤں میں رہتے ہوئے ہو گیا تھا۔

کہتے ہیں محبت لاکھ پردوں میں چھپائے بھی نہیں چھپ سکتی۔"

ایک دن باوا سمیر گر نے کہا۔

"بیٹا! زمانہ بہت نازک ہے۔ لوگ سادھو مہاتماؤں کو بھی بدنام کر دیتے ہیں یاد رکھو! پریم کرنا بہت آسان ہے اسکو نبھانا بہت مشکل ہے"۔

"مہاراج آپ کی اشیرباد چاہیئے ——"

ہم تو سچے پریمی کو سدا ایشرباد دیتے ہیں تمہیں اب یہاں سے چلے ہی جانا چاہیئے

"مہاراج یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ——"

ہاں! ہم نہیں چاہتے کہ گاؤں والے مندر کو بدنام کریں۔ ہم یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ پریم کوئی پاپ نہیں ہے ——"

"اچھا مہاراج میں چلا جاؤنگا۔ اور آج ہی رات کو ——"

"جمنا دوپہر کو آئی مدن اداس بیٹھا ہوا تھا ——"

آج نہیں پڑھاؤ گے ——؟"

آج تو آخری دن ہے جمنا۔ بھگوان جانے اب زندگی میں ملیں یا نہ ملیں ——"

"ایسا کیوں ——! میں سمجھی نہیں ——"

"میں آج چلا جاؤنگا جمنا۔ میں اپنی جمنا کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"چلے جانا۔ مدن پردیسی کو کون روک سکتا ہے ——"

"جمنا چلو۔ بھگوان کے مندر میں چلیں ——"

"چلو جہاں چاہو لے چلو ——"

مدن اور جمنا مہادیو کی مورتی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ مدن کی آنکھوں میں

آنسو تیر رہے تھے۔

"بھگوان تم ساکھشی ہو۔ جمنا میری ہے اسے میری ہی رکھنا بھگوان ــــ"

"جمنا کی آنکھوں سے آنسو کی دھارا بہہ نکلی۔ کہنے لگی بھگوان مجھے بابو کے چرنوں میں ہی جگہ دینا۔ اگر یہ نہ دے سکو تو اس جہان سے اُٹھا لینا۔ تمہارے سامنے ہم ایک دوسرے کے ہوتے ہیں سنکھٹ پڑنے پر ہماری سہائتا کرنا۔ بھگوان۔

جمنا نے مدن کے چرنوں میں نمسکار کیا۔ اور دھول لے کر سر پر رکھی آنکھوں سے لگائی ــــ!!

"مدن بابو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر تم نے مجھے بھلا دیا تو میں کہیں کی نہ رہونگی۔

"جمنا! یاد کرنے والے کی ہمیشہ یاد آیا کرتی ہے۔ جب تک زندگی ہے بھول نہیں سکتا

"لیکن تم نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ کیوں جا رہے ہو۔ اور کہاں ــــ؟

اِس میں دونوں کی بھلائی ہے جمنا۔ جاؤں گا۔ دُور۔ کسی بڑے شہر میں۔ جہاں نام پیدا کروں گا۔ پھر میں اپنی جمنا کو ساتھ لے جاؤں گا ــــ"

"جا کر واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔ بابو۔ پھر شہر میں جہاں ہر طرف زندگی کھیلتی ہے۔

"محبت کوئی کھیل نہیں جمنا میں نے پہلے ہی کہا تھا پریم کرنا آسان ہے۔ نبھانا مشکل ہے"

"لیکن میرا کیا ہے گا۔ یہ بھی سوچا ہے ــــ"

"ہاں! سوچا ہے۔ اسلئے تو بھگوان کو ساکھشی کیا ہے ــــ"

اتنے میں باوا سمیر گر آگئے۔

جمنا بیٹا۔ سچے پریم کی ہمیشہ جیت ہوا کرتی ہے جدائی کسوٹی ہے ایک دوسرے کو پرکھنے کی۔ پریم کرنا پاپ نہیں تشہیر کرنا پاپ ہے بیٹا تم خوشی سے مدن کو جانے دو

آج کا دُکھ درد آئندہ زندگی کی خوشی کا سہانا منظر ہوگا۔"

"جیسی آگیا مہاراج ——————"

جمنا واپس گھر تو چلی گئی۔ لیکن آج وہ دیوانی ہوگئی تھی۔ اگر ماں پانی لانے کو کہتی تو وہ لکڑیاں اُٹھا لاتی۔ اگر برتن صاف کرنے کیلئے کہتی تو پانی لینے چلی جاتی۔ شام ہوئی وہ پھر مندر میں آئی۔ مدن جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس ایک بستر تھا اور چند کپڑے۔ باوا سمیر گر نے بیس روپے بھی مدن کو دیئے تھے ٹکٹ کیلئے۔ جمنا کو دیکھ کر اُس کے ہاتھ سے بستر گر گیا۔

باوا سمیر گر نے کہا۔ "بیٹا دِل کو میلا مت کرو تم جا رہے ہو زندگی سنوارنے"۔

مدن سنبھل گیا اور پھر اپنا بستر اُٹھایا۔

"جمنا پردیسی کو بھول نہ جانا جس راستے جا رہا ہوں۔ ایکدن اسی راستے واپس آؤنگا۔

اُمید پر ہی تو جیتی رہوں گی یا اِن آنسوؤں کو یاد رکھنا۔ یہ دن بدن زیادہ ہی ہوتے جائینگے۔ ایسا نہ ہو کہ میری موت کا سبب بن جائیں ——————"

اپنی جمنا کو بھول جاؤں —— جمنا! تُو نے مدن کے دل کو نہیں دیکھا۔ جہاں صرف جمنا ہی جمنا ہو جن ہے۔

مدن چلا گیا۔ جمنا کو روتے سسکتے چھوڑ کر۔ اُس نے قدم قدم پر پیچھے مڑ کر جمنا کو دیکھا جو دیوار کا سہارا لئے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا رہی تھی۔ لیکن وہ چلا گیا ——

مدن دہلی اسٹیشن پر اُترا اور فتحپوری دھرمسالہ میں آکر ٹھہر گیا۔

صبح ہوئی چاندنی چوک کی چہل پہل دیکھی دل کو تسکین ہوئی۔ چھ روپے اسکے پاس تھے۔ اُس نے دریافت کیا کہ تھوک کا مال کہاں سے ملتا ہے۔ وہ سیدھا صدر بازار پہنچا۔ پانچ روپے کے رومال خریدے۔ اور چاندنی چوک میں آکھڑا ہوا۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ چند ہی گھنٹوں میں سب مال بیچ دیا۔ ڈیڑھ روپیہ بچ گیا۔ اُس نے دوبارہ جا اور رومال خریدے۔ اور پھر آکر بیچنے شروع کر دیئے۔ وہ بھی رات کے آٹھ بجے تک فروخت کر دیئے۔ آج کی محنت سے اُسے چار روپے بچے تھے۔ آٹھ آنے کا کھانا کھا کر دھرم سالہ میں جاکر سو گیا۔ اب اس کا روز کا کام ہو گیا تھا صبح سے لے کر رات کے دس بجے تک چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مال فروخت کرتا۔ پندرہ دنوں کے اندر اندر اُسکے پاس پچاس روپے پس انداز ہو گئے تھے ——————

دن گزرتے گئے اور اُس کے پاس سرمایہ بڑھتا گیا۔ مدن نے باوا اسمیر گر کو کئی ایک چٹھیاں لکھیں اُس نے جمنا ہی سے جواب لکھوایا تھا کتنی خوش ہوتی تھی جب جمنا چٹھی میں اپنا نام پڑھا کرتی تھی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جواب دیتی۔ مدن جب رات کو دھرمسالہ میں جاکر سوتا گھنٹوں جمنا کے تصور لیے کروٹیں بدلتا رہتا۔ اور خواب میں بھی گذرے ہوئے دنوں کا نظارہ دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ جمنا سے کوسوں دُور تھا۔ وہ لیکن محسوس یہی کر رہا تھا۔ کہ جمنا ہر وقت اُس کے پاس ہے۔ جمنا بھی کئی کئی گھنٹے مندر میں آکر بھگوان کی مورتی کے سامنے بیٹھ جاتی اور پرارتھنا کرتی۔ بھگوان میری یاد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مدن بابو کے دل میں بسی رہے ——————

بھگوان کے خزانے بھرپور ہیں۔ صبح سے شام تک کتنی ہی لوٹ مچی رہے۔ لیکن وہاں کمی نہیں آتی۔ افسوس نہیں ہوتا۔ حسد نہیں ہوتا۔ لالچ نہیں ہوتا۔ دھن کے لیے بھائی بھائی

کا دشمن نہیں ہوتا ــــــ

مدن اب ایک دوکان کا مالک تھا۔ اسکی دوکان پر نوکر بھی تھے۔ لیکن وہ خود صبح سے لیکر رات کے دس بجے تک دوکان پر کام کرتا۔ اور دوکان پر ہی سو جاتا۔ کھانا ہوٹل سے کھا لیا کرتا تھا ــــــ

اُس کو وشواش تھا۔ کہ ایک دن وہ آئیگا جب لاکھوں کا مالک ہونگا۔ جو بھی مال خریدتا۔ یہی وشواش لیئے ہوئے کہ اس میں اس کو منافع ہی ہوگا ــــــ آتما کی آواز بھگوان کی آواز ہوا کرتی ہے۔ مدن کا وشواش دِن بدِن بڑھتا گیا۔ اب دولت اسکے پیچھے بھاگتی تھی۔ قدم چُومتی تھی۔ جن لوگوں نے مدن کو پٹری پر کھڑے رومال بیچتے دیکھا تھا۔ حیران ہوتے تھے۔ کہ معمولی عرصہ میں نردھن دھن والا بن گیا ــــــ

مدن کا ایک رُخ تھا جو وہ خود ہی جانتا تھا۔ یا پھر وہ۔ جمنا کے کنارہ بسنے والے سینکڑوں۔ غریب۔ محتاج۔ رات کے اندھیرے میں بھیس بدل کر مدن وہاں جاتا۔ ہر ایک جھونپڑے میں جاکر اُن کو کھانے کے لیئے دیتا ضرورت مند کو کپڑے۔ کس بے صبری سے وہ اس کا انتظار کیا کرتے رات کو۔ اور مدن بھی بلا ناغہ وہاں ضرور پہنچ جاتا۔ اُس کو طوفان آندھی۔ بارش۔ ایک دن بھی جانے سے باز نہ رکھ سکی۔ جونہی رات کے ۹ بجتے۔ اُس کے کانوں میں آواز کو گونجنی شروع ہوتی بابو جی۔ ایک روٹی اور دے دو آج مانگنے پر کچھ نہیں ملا۔ دیکھو بابو جی۔ یہ دھوتی۔ اِس سے تو بدن بالکل ننگا دکھائی دیتا ہے۔ بابو۔ بچے جمنا پر نہانے آتے ہیں۔ کھلونے خریدتے ہیں۔ میں نے کبھی ہاتھ میں لیکر بھی نہیں دیکھا۔ ہمارے تو بابو جی بھگوان ہیں۔ اگر دو دن نہ آئیں تو ہم بھوکے مر جائیں۔ کتنا پیار تھا ان کے دلوں میں مدن کے لئے۔ وہ رات کے اندھیرے میں جہاں مٹی کا دیا بھی نہ جلتا تھا۔

اپنے مدد گار کو پہچان بھی نہ سکتے تھے نام جانتے تھے۔ اگر کہیں دن کو مدن یا بو مل بھی جاتے تو کوئی نہ جانتا۔ کہ یہی بابو رات کو اُن کے ہاں روزانہ آکر کھانا دیتا ہے۔

مدن کے دل میں ایک دن بھی یہ خیال نہ آیا۔ کہ وہ رات کو جاکر کھانا کھلاتا ہے اُس نے تو اپنا ایک فرض سمجھ لیا تھا۔ جیسا صبح سے لے کر شام تک کاروبار کے دھندے میں لگا رہتا۔ اسی طرح وہ شام کو وہاں جانا بھی اپنا فرض نہیں سمجھتا تھا۔

دن گذر رہے تھے اور مدن دن بدن بیوپاریوں میں شہرت حاصل کرتا جارہا تھا اب اس کی ایک ہی دوکان نہ تھی۔ ٹھوک مال کی صدر میں ایک دوکان تھی۔ نئی دہلی میں الگ۔ اور چاندنی چوک میں پُرانی دوکان۔ اس نے ولایت سے مال منگوانے کے لئے ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم بھی جاری کر دی تھی۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی اس کے دماغ میں دولت کی بُو نہ تھی۔ جس کسی سے ملتا وہی شیریں زبان۔ وہی نمرتا اور وہی سادگی۔ اُس نے عالیشان بلڈنگ بھی بنانی تھی جس میں وہ رہتا تھا۔

چھ سال کے عرصے میں اس قدر تبدیلی قسمت کا ایک کرشمہ تھا۔ اُس نے کئی بار کوشش کی۔ کہ ایک دفعہ جاکر جنا سے مِل آئے۔ لیکن کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ ایک بار بھی نہ جا سکا۔ آخر ۱۹۴۷ء آیا۔ راولپنڈی سے لوگ بھاگنے شروع ہوئے کنول سین بھی تارا کو لے کر اور کچھ سامان لے کر وہاں سے نکلا۔ لاہور میں اُس کے دوست تھے۔ اُن کے ہاں پہنچا۔ چند دن ٹھہرا۔ لیکن لاہور میں بھی وہی آگ مار کاٹ کی وارداتیں ہونی شروع ہو گئیں تھیں اس نے کوشش کی کہ وہاں سے بھی چلا جائے۔ لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جس وکیل کے یہاں ٹھہرا تھا وہ کہنے لگا پنجاب گورنمنٹ کی راجدھانی ہے لاہور۔ یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ ٹرڑی ہے۔ پولیس ہے اور پھر لاکھوں

ہندو موجود ہیں۔ تمہیں ڈر کس بات کا میرے بھائی ——————"

کنول نے راولپنڈی میں ہونیوالے واقعات بچشم خود دیکھے تھے، اُسکا دل کانپ رہا تھا ٹھیک ہے یہ لاہور راجدھانی ہے۔ لیکن جب حکومت ہی خلاف ہو جائے۔ تو کیا چارہ ایسا کبھی دُنیا میں ہوا بھی ہے یہ تو اَن پڑھ لوگوں کی سی باتیں ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء کی گیارہ تاریخ تھی۔ چاروں طرف آگ ہی آگ دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک پر کوئی جاندار بھی چلتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

لالہ منگلداس نے جب یہ حالت دیکھی تو اُس نے راجہ سرور خاں کو ٹیلیفون کیا کہ کسی طرح طرح ہمیں امرت سر پہنچاؤ ——————

سرور خاں بھی وکیل تھا اور منگلداس کے بچپن کا ساتھی۔ مقدمات میں بھی وہ ایکدوسرے کی مدد کرتے تھے۔ منگلداس کے ٹیلیفون نے اُسکے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کیا میرا ساتھی یونہی چلا جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی اُس کو یہ بھی خیال آیا کہ اگر کہیں منگلداس کے ساتھ کچھ اور واقعہ ہو گیا تو وہ خدا کے سامنے کیا جواب دے گا۔

"میں ابھی آیا منگلداس۔ ابھی ——————"

سرور خاں نے اپنی عورت کے برقعے لیے۔ کار لی اور منگلداس کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے پہلے سے ہی ضروری سامان اور نقدی ایک بکسے میں رکھ لی تھی۔ جونہی سرور خاں کی کار کوٹھی کے سامنے کھڑی ہوئی۔ منگلداس کی جان میں جان آئی۔ کنول نے نقدی اور چند ایک کپڑے ساتھ لیے برقعے پہن کر تارا، کملا اور چنچل نیچے اُتریں۔ کار میں بیٹھ کر گرانڈ ٹرنک روڈ پر چل پڑے۔ سٹیشن کے نزدیک چند ایک غنڈوں نے کار کو روکا تو ضرور لیکن راجہ سرور خاں کو دیکھ کر کار کو جانے کی اجازت دے دی۔

منگلداس اور کنول سین امرت سر پہنچے امرت سر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سڑکوں پر گوردواروں، مندروں، مسجدوں میں جہاں دیکھو انسانی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا دیتا تھا۔ ایک ایک ہوٹل پر اتنی بھیڑ تھی کہ گھنٹوں کھڑے ہونے پر بھی کھانا نہ ملتا تھا۔

کنول سین وکیل تھا دماغ میں وکالت کا نشہ وہ کیمپوں میں کھانا کھا سکتا تھا۔ دن بدن اثاثہ کم ہوتا گیا۔ اُن دنوں بات کرنی بھی مہنگی تھی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی اسلئے منہ مانگے داموں پر بھی اشیاء خوردنی ملنی مشکل تھی۔ کنول سین کی حالت کمزور ہوتی گئی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مگر خرچ کمر توڑ رہا تھا۔ اخیر حالت فاقوں پر آئی تو کیمپ میں تارا کو۔ دے کر چلا گیا۔

گجرات شہر میں بھی یہی وبا پھیلی۔ پپلی گاؤں ابھی اس کی لپیٹ میں نہ آیا تھا۔ لیکن کب تک شہروں کے حالات سُن سُن کر اُن کے دلوں میں بھی نفرت کی آگ تیز ہوئی جگہ جگہ سے خبریں آتیں کہ فلاں گاؤں لُوٹ لیا گیا۔ اور وہاں کی نوجوان لڑکیوں کو چھین لیا گیا ہے۔ نمبردار موہن لال کے کانوں میں جب یہ خبر پہنچتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔

"جمنا نے بھگوان سے پرارتھنا کی اے بھگوان تم تو ساکھشی تھے۔ یہ کیا کر دیا میری زندگی تباہ کر دی اِس سے تو موت ہی دے دیتے تو اچھا تھا"۔

میری جمنا بھی نوجوان اور خوبصورت ہے میری آنکھوں کے سامنے اسکی عزت برباد ہو گی۔ اُس نے باوا سمیر گر سے مشورہ کیا۔ کہ جمنا کی شادی کر دوں تاکہ اُس کی عزت پر کوئی دھبہ نہ آئے۔ لیکن باوا سمیر گر نے صلاح نہ دی۔ وہ جمنا کے دل کو جانتا تھا لیکن موہن لال نے جب یہ سُنا۔ کہ نزدیک کے گاؤں سے جب لوگ بھاگ رہے تھے تو اُنکی

تمام نوجوان لڑکیوں کو غنڈوں نے زبردستی چھین لیا ہے۔ اُن میں سے کئی ایک نے تو کوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اور کئی ایک اُن کے ساتھ موت کے ڈر سے چلی گئیں تو وہ برداشت نہ کر سکا اُسی دن اُس نے پنڈت کو بلا کر راجو کے ساتھ جمنا کی شادی کر دی اور رات کی تاریکی میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ موت کے بیرحم سائے کو وہ اپنے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ جا رہے تھے۔ چلتے چلتے وزیر آباد پہنچ گئے۔ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی سب سوار ہو گئے۔ اب اُن کو کچھ حوصلہ ہوا۔ گوجرانوالہ سٹیشن آیا۔ جمنا کو پیاس نے ستایا ہوا تھا۔ موہن لال، پانی کے لئے گیا۔ راجو فوراً اُٹھ کر پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ جونہی اُس نے نل سے پانی لینا شروع کیا۔ کسی نے چھرے سے وار کر دیا۔ وہ وہیں چت ہو گیا۔ موہن لال نے جب، راجو کو خون میں لت پت دیکھا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ دل نے کہا۔ کہ داماد ہے نعش کو تو اُٹھا لو۔ لیکن موت کو سامنے دیکھ کر ہمت نے جواب دے دیا گاڑی روانہ ہوئی۔ جمنا کی آنکھوں میں نہ آنسو آئے۔ اور نہ ہی زبان سے آہ نکلی۔ وہ تو خاموش بیٹھی تھی یونہی بیٹھی رہی ساتھیوں کو راجو کے مرنے کا رنج ہوا۔ گاڑی تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ گوجرانوالہ کے واقعہ سے گاڑی کو چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر کھڑا نہ کرنے کی اجازت گارڈ نے ٹیلی فون سے منگوائی تھی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی لاہور پہنچی وہاں کی حالت دردناک تھی۔ پلیٹ فارم صرف انسانی سروں کا بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گاڑی کے پہنچتے ہی مسافروں نے چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ اور چند ہی منٹوں میں گاڑی میں اتنے مسافر ہو گئے کہ آدمی پر آدمی کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ گاڑی کی چھت فٹ بورڈ جہاں دیکھو انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ ریلوے والوں نے بھی منع کرنے کی جرأت نہ کی۔ گاڑی چل پڑی۔ اور ایک گھنٹہ میں امرت سر پہنچ گئی اب مسافروں کی جان میں جان آئی

لیکن پلیٹ فارم کی حالت دیکھ کر کوئی بھی اُترنے کو تیار نہ ہوا۔ گاڑی وہاں سے دہلی روانہ ہوئی۔

مدن کو اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر بہت صدمہ پہونچا۔ اُس نے سٹیشن پر لنگر لگوا دیا۔ مُفت کھانا اور کپڑا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ دولت کم ہوتی ہے۔ جس پر انسان سانپ بن کر بیٹھ جائے اور بڑھتی ہے۔ جن کو ہزار ہاتھوں سے غریبوں محتاجوں میں بانٹا جائے۔ مدن جس قدر دولت دان میں خرچ کر رہا تھا۔ اُس سے دوگنی چوگنی بیوپار میں مُنافع کی شکل میں آ رہی تھی چند دنوں میں مدن کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ کوئی اُس کو دیوتا کہتا۔ اور کوئی مہادانی پُرش۔ یہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے من کو شانتی نہ تھی۔ وہ یہی سوچتا جمنا کس حال میں ہوگی۔ باوا سمیر گر کہاں ہونگے۔ بھابی تارا کس مصیبت میں ہوگی۔ مدن نے ہر ایک اخبار میں اشتہار شائع کرائے لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔

منگلداس نے پرتاپ اخبار میں مدن کا اشتہار پڑھا۔ جس میں لکھا تھا کہ راولپنڈی کے رہنے والے کنول سین وکیل کا پتہ دینے والے کو پچاس روپیہ انعام اور دہلی تک آنے جانے کا خرچ پیش کیا جائے گا۔

وہ فوراً کنول سین کے پاس لیا۔ اخبار کا پرچہ دیا۔ کنول سین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دِل نے ملامت کی۔ خاندانی خون نے جوش مارا وہ تارا سے کہنے لگا۔

مدن نے اخبار میں ہمارے لئے اشتہار دیا ہے۔ چلو دہلی چلیں۔

"کس مُنہ سے وہاں جائینگے نا تھ۔"

"کیوں وہ تو خود بھاگ گیا تھا۔ میں نے کوئی گھر سے تھوڑے ہی نکالا تھا۔"

"ہاں نکالا تو نہیں تھا یہ کہا تھا کہ چلے جاؤ ــــ"

"کیا ہوا تارا۔ آخر میرا چھوٹا بھائی ہے ــــ"

"اسی لئے تو کہتی ہوں کہ کیا منہ لے کر جائینگے ــــ"

چلو تو سہی دیکھا جائے گا۔

منگلداس سے بھی کنول سین نے چلنے کے لئے کہا۔

پہلے تو منگلداس نے چلنے کے لئے انکار کیا اور کہا

"کنول سین یہ وقت کچھ ایسا ہے کہ بھائی بھائی کو نہیں پہچانتا۔ باپ بیٹے کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ میں بوجھ بنکر بال بچوں کو لیکر تمہارے بھائی کے گھر کیسے جا سکتا ہوں"۔

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے منگلداس جی۔ گھر سے تو نکال نہیں سکتا۔ اگر اچھا برتاؤ نہ کرے گا تو برا بھی نہیں کر سکتا۔"

"اگر تم چاہتے ہو۔ تو چلو کنول سین۔ دہلی چلے چلتے ہیں"۔

چنانچہ کنول سین، تارا، منگلداس کملا اور چنچل دہلی پہونچ گئے۔ کنول نے مدن کی کوٹھی دیکھی۔ شان و شوکت دیکھی۔ کوٹھی میں تین چار کاریں دیکھیں شش و پنج میں پڑ گیا۔ بولا یہ کوئی اور مدن ہوگا۔ میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔ منگلداس جی چلو

واپس چلیں لیکن اخبار میں تو اسی کوٹھی کا ایڈریس تھا۔

"نہیں بھگوان داس جی میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ میٹرک تو پاس تھا۔ اور پھر کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہی چھ سات سال تو ہوتے ہیں۔ اُس کو گھر سے آئے ہوئے سات سال میں وہ کیا اتنی دولت اکٹھی کر سکتا ہے"۔

اتنے میں مدن کار میں آیا بھائی کو دیکھ کر کار سے اُترا۔

پاؤں پر گر کر نمسکار کیا۔ بھائی کے پاؤں کو چھوا۔

"بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔ آپ نے۔ میں نے کئی بار اخبار میں اشتہار دیا۔ انعام رکھا۔ لیکن مجھے کہیں سے بھی کوئی جواب نہ ملا"۔

اب تو آ گئے ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں لالہ منگلداس جی۔ وکیل لاہور۔ یہ تمہاری بھابی کملا اور یہ بیٹی چنچل۔

"یہ آپ کا ہی گھر ہے لالہ جی۔ چلئے اندر۔ آرام کیجئے ——"

"مدن یہ کوٹھی کرایہ پر لے رکھی ہے۔ بہت کرایہ ہوگا اس کا تو ——"

"نہیں بھائی صاحب۔ کرایہ پر نہیں۔ اپنی ہی ہے"۔

"کیا کام کرتے ہو؟ ——"

یہی دوکانداری ——"

کہاں دوکان ہے ——"

چاندنی چوک۔ صدر بازار۔ نئی دہلی تین دوکانیں ہیں اور ایک فرم اکسپورٹ

امپورٹ کی ہے بھگوان شنکر خود ہی کاروبار چلاتے ہیں۔ میں تو دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا اچھا ہوا جو آپ آ گئے ـــــ"

منگلداس مدن کی شرافت۔ شیریں زبانی دیکھ کر قائل ہو گیا۔

"کیا عمر ہو گی مدن کی ـــــ"

"سولہ برس کا تھا۔ جب گھر سے آیا تھا۔ اب بائیس سال کا ہو گا ـــــ"

"بھائی اُٹھو۔ نہا لو۔ اور کپڑے بدل لو ـــــ"

"کپڑے تو نہیں ہیں مدن۔ جو کچھ تھا۔ کچھ راولپنڈی اور باقی لاہور ہی رہ گیا۔ اب یہی کپڑے تن پر رہ گئے ہیں ـــــ"

"میں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں۔ یہاں ہی بزاز آ جائے گا ـــــ"

چنانچہ مدن نے اُس وقت بزاز کو کوٹھی پر بُلا لیا۔ اور سب کے تین۔ تین چار چار سُوٹ بنوا دیئے ـــــ!!

کنول سین۔ اور منگلداس کو وہاں رہتے ہوئے ایک ماہ گذر گیا۔ مدن دِن بدِن زیادہ محبت پیار اور خدمت کر رہا تھا۔ کنول سین کو تو اسکا احساس نہ ہوا لیکن تارا جس وقت بھی مدن کو دیکھتی آنکھیں نیچی کر لیتی۔ ایک دن تارا نے کہہ دیا۔

"مدن ہمنے تو تم سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا بھائی ـــــ"

"اچھا ہی تو کیا تھا۔ جس سے آج میری حالت ہے۔ اچھا کرنے سے اچھے کی اُمید ہر

کوئی کرتا ہے بھابی۔ میں تو چھوٹا ہوں۔ تمہارا اپنا مدن ــــ"

"مجھے شرمندہ کرتے ہو۔ مدن ــــ"

"ماں کے مرنے کے بعد تم ہی تو میری ماں ہو بھابی۔ کیا میں ماں سے بھی کچھ نہ کہوں"

تارا کی آنکھوں میں وفورِ جذبات سے آنسو آ گئے۔

(:)

چنچل نے لاہور کی گلیوں میں پرورش پائی تھی۔ نوجوانوں کو تیرِ نظر کا شکار کر کے تڑپانا اُس نے سیکھا ہوا تھا۔ مدن کی دولت، حسن و شرافت چنچل کے دل کو تڑپا رہی تھی اُس نے کئی ایک بار اپنی ناگن سی زُلفوں میں مدن کو پھنسانے کی کوشش کی۔ دلفریب حُسن سے مدن کے دِل کو تڑپانے کی کوشش کی۔ لیکن سب بے سُود۔ وہ تو پہلے ہی نیم بسمل تھا۔ اُس کے دِل میں جمنا کی سادگی۔ خاموش محبت نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ اُس نے ایک نظر بھی چنچل کو نہ دیکھا۔ ایک دن چنچل نے موقعہ پا کر مدن سے کہا "مسٹر مدن آپ چپ چاپ کیوں رہتے ہیں ــــ"

"نہیں تو ــــ"

"آپ کے چہرہ پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی ــــ"

ہنسنا اور رونا بھول چکا ہوں بہت دنوں سے ــــ"

"آپ نے ابھی شادی نہیں کی ــــ؟"

"شادی تو کر چکا ہوں لیکن ساتھ نہیں رکھ سکا اپنی جانِ آرزو کو ــــ"

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ مدن بالکل نہیں سمجھی"۔
"آپ کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیئے ——"

——— ؛ ———

منگلداس نے ایک دن کنول سین سے کہا "مدن کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ تم بھی تو اس کے بڑے بھائی پتا کے سمان ہو۔ اچھا گھر دیکھ کر اس کی شادی کر ڈالو"۔

میں تو ابھی یہاں آیا ہوں۔ کوئی گھرانہ دیکھ لوں ۔ پھر مدن سے بات کروں گا

"میری چنچل ——" الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

"لالہ منگلداس جی۔ اس سے اچھا گھرانہ اور کہاں ملے گا۔ ہم بچپن کے دوست ہیں اب رشتہ دار ہو جائینگے۔ میں آج ہی مدن سے بات کروں گا۔ وہ کبھی میری بات نہیں ٹالے گا"۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ اب چنچل کی شادی کر ہی دوں۔ جوان ہو گئی ہے۔ پھر مدن کوئی پرایا نہیں۔ چنچل اپنے ہی گھر رہے گی۔ اور دوسرے مجھے دینے لینے کی چنتا نہ ہوگی

"دینا۔ لینا؟ یہ سب کچھ تو آپ کا ہی ہے منگلداس جی۔ پھر ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ مجھے شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو سچ ہی کہا ہے۔ اب میرے پاس رہا ہی کیا ہے"

"سب کچھ ہے منگلداس جی ذرا دہلی کی حالت سدھرنے دیجئے۔ کوٹھی ہوگی۔ اور ہم۔ دیکھنا تو سہی۔ چند ہی مہینوں میں پھر وہی شان و شوکت۔ جاہ و جلال ہو جائے گا۔

"اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ کنول سین ——"

لیکن جب تک عدالتیں کھُلی ہیں وکیل بیکار نہیں بیٹھینگے۔

مدن جب شام کا کھانا کھا چُکا تو کنول سین نے کہا۔

"مدن چنچل کو تو دیکھا ہے تُم نے۔ اچھی لڑکی ہے ــــ!"

"ہاں ــــ ٹھیک ہی ہے ــــ"

"اس کے ساتھ تمہاری شادی طے کر رہا ہوں تمہیں اعتراض تو نہیں ہے"

"میں نے تو مدّت ہوئی شادی کر لی ہے ــــ"

"ہم نے تو بہو رانی کو دیکھا ہی نہیں۔ جب دن سے آئے ہیں ــــ"

"وہ یہاں نہیں رہتی ــــ"

"تم جا کر اُسے لے آؤ ــــ"

"لے آؤں گا۔ ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ــــ"

"کہاں رہتی ہے وہ۔ ــــ؟"

"یہاں سے بہت دُور ــــ"

"لیکن میں نے تو سُنا تھا کہ یہاں کوئی عورت نہیں آئی ــــ"

"ہاں۔ یہاں نہیں آئی۔ وہ الگ مکان میں رہتی ہے۔ وہاں نوکر نہیں جا سکتے"

"ایسا تو نہیں مدن کہ تم مجھ سے جھُوٹ بول رہے ہو ــــ"

"اپنے بڑے بھائی کے سامنے کوئی جھُوٹ بول سکتا ہے ــــ"

مدن اب بھی جمنا کے کنارے شام کے آٹھ بجے روزانہ جاتا۔ اور دو دو تین

تین گھنٹے بعد کوٹھی آیا کرتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ روزانہ کہاں جاتا ہے۔

(۲)

موہن لال اور جمنا بھی دہلی آگئے تھے۔ پہلے کچھ دن سٹیشن پر رہے۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر وہ بھی جمنا کنارے آباد ہوگئے۔ موہن لال نے اپنے ہاتھوں سے کبھی کام نہ کیا تھا گاؤں کا نمبردار تھا۔ مزارعہ سب کام کرجاتے تھے۔ وہ تو تمام دن بیٹھا بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا۔ یا گاؤں والوں کے شکوہ وشکایت سُنتا رہتا تھا۔ جس دِن سے۔ وہ دہلی آیا تھا۔ زمیندار ہونے کی حیثیت سے اُس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا کام کرنے کا عادی ہوتے ہوئے بھی وہ کام کرنے سے نہ ڈرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے قلی کا پیشہ اختیار کیا۔ سارا سارا دن فحتپوری بازار جاکر بوجھ اُٹھاتا۔ اور شام کو جمنا کے لئے کھانا لے کر اپنی جھونپڑی میں پہونچتا جو اس نے گھاس پھوس کی وہاں بنالی تھی۔

باوا سمیر گر اُن سے جُدا ہوگیا تھا۔ پہلے تو وہ ہردوار گیا۔ وہاں اس نے تین مہینے گذارے۔ وہاں سے نہ معلوم۔ کیا خیال آیا کہ وہ بھی دہلی آگیا۔

مدن ایک رات غریبوں، محتاجوں، سادھوؤں مہاتماؤں کو روز کی طرح کھانا بانٹ رہا تھا کہ وہ باوا سمیر گر کے پاس پہنچ گیا۔ باوا سمیر گر کی اب وہ صحت نہ تھی لیکن پھر بھی بھگتی کا جلال چہرہ پر بدستور قائم تھا۔

"لیجئے۔ سادھو مہاراج"۔ مدن کی آواز سُن کر باوا سمیر گر چونک پڑے۔

مدن! تم ــــ؟

اور مدن باوا سمیر گر کے چرنوں پر گر گیا۔ مہاراج کشما کرنا۔ میں نے پہچانا نہیں"۔

اور رونے لگ گیا ــــــ!

"میں نے بھی تو نہیں پہچانا مدن ــــــ!!"

باوا سمیر گر نے مدن کو اُٹھایا۔ بیٹا۔ پھر وہی بات تمہیں تو خوشی ہونا چاہیئے کہ مدّت کے بعد مُلاقات ہوئی ہے۔

"آج میرا جیون سپھل ہوا مہاراج چلئے گھر چلیں ــــــ"

"سادھو گرہستی کے گھر نہیں رہا کرتے ــــــ"

"گرہستی تو سادھو کے گھر رہ سکتا ہے۔ مہاراج ــــــ"

ہاں وہ تو بھگوان کا گھر ہے۔ جس پر سب کا ادھیکار ہے۔ وہاں یہ چلتا نہیں کہ یہ ہندو ہے۔ مُسلمان ہے۔ اچھوت ہے۔ یا کوئی اور ــــــ"

"میں تو مہاراج گرہستی نہیں۔ آپ کا داس ہوں ــــــ"

"تو تم نے شادی نہیں کی ــــــ"

"کیسے کرتا مہاراج۔ بھگوان شنکر جو ساکھشی تھے۔ جمنا کہاں ہے مہاراج ــــــ"

جمنا ہڈیوں کا ڈھانچہ وہ بیچاری بھی مصیبت کی ماری انبالہ تک اپنے پتا کے ساتھ آئی تھی۔ ہم ہردوار چلے گئے۔ معلوم نہیں کہ وہ پتا اور بیٹی کہاں رہ گئے۔

"میں نے تو کئی اخبارات میں اشتہار دیا ہے مہاراج ــــــ"

"بیٹا۔ وہ کوئی پڑھے لکھے تھوڑے ہی ہیں۔ اور پھر اس کے پاس پیسہ کہاں جو

اخبار لے کر پڑھتے ہوں گے ـــــ"

"مہاراج میں کس طرح جمنا کو ڈھونڈھ سکتا ہوں۔ آپ ہی کوئی راستہ بتایئے"

"ڈھونڈنے والے کو راستہ مل ہی جایا کرتا ہے بیٹا ـــــ"

(:)

اِدھر کملا نے تارا سے اِس کا تذکرہ کیا ـــــ

"چنچل بھی نوجوان ہو گئی ہے۔ اور تمہارا مدن بھی نوجوان ہے ـــــ"

"لیکن وہ تو کہتے ہیں کہ شادی کر چکے ہیں"۔

"یہ تو کہنے کی باتیں ہیں۔ اگر شادی کی ہوئی ہوتی۔ تو تم ہی دیکھو تارا گھر کی یہ حالت ہوتی۔ جہاں گھر میں چند مہینے عورت رہ جائے وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر میں کبھی کسی نے قدم ہی نہیں رکھا ـــــ"

"مدن جھوٹ نہیں بول سکتا ـــــ"

"حالات ہوتے ہیں تارا۔ جو بعض وقت جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

"اچھا میں خود پوچھوں گی ـــــ"

(:)

مدن دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا۔ کنول سین اور منگلداس ابھی بازار سے ہی نہ آئے تھے۔ تارا مدن کے پاس آئی۔

"مدن۔ بہو کو بلا ہی لو نا ـــــ"

"ماں جب گھر میں آ گئی تو بہو کی کیا جلدی ہے ــــــ"

"گھر تو اُسی کا ہے نا۔ مدن ــــــ"!

"یہ سمجھ کا پھیر ہے، بھابی میرا تو سب کچھ آپ کا ہی ہے۔ آپ اگر نہ سمجھ تو میری کیا بھول دس میں ــــــ"

"مدن اتنا سُکھ تو میں نے راولپنڈی میں بھی نہ پایا۔ ماں سے زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہو۔ جو سلوک ہم نے کیا تھا۔ میں ہی جانتی ہوں ــــــ"

"اِسی لئے تو بہو کو نہیں لاتا بھابی۔ کہ اوسکو بھی کہیں گھر سے نہ نکال دے"

"مدن کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ سچ سچ کیوں نہیں بتاتے۔ ماں سے بھی کوئی بات چھپاتا ہے ــــــ"

"میں نے کونسی بات چھپائی ہے۔ بھابی جب میں گھر سے آیا تھا تو گاؤں میں ٹھہرا تھا۔ نمبردار کی لڑکی جمنا سے میں نے بھگوان کے سامنے شادی کی تھی۔ اب اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ بیچاری بھی کہیں دُور دُور کی ٹھوکریں کھاتی ہوگی ــــــ"

"مدن لاکھوں کے مالک ہو۔ اور گاؤں کی گنوارن سے شادی کرو گے"

"گنوارن نہ کہو بھابی۔ گاؤں کی دیوی کہو تم کیا جانو سچا پریم معصوم دل میں ہی ہوا کرتا ہے ــــــ"

"جواب تک نہیں آسکی۔ وہ اب کیا آئے گی۔ ہزاروں لڑکیاں وہاں موت کے گھاٹ اُتار دی گئیں۔ ہزاروں نے خودکشی کر لی۔ ہزاروں نے غنڈوں کے ہاتھوں

اپنی زندگی برباد کر دی۔ ممکن ہے جمنا بھی اُن میں سے ایک ہو ——"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بھابی۔ کبھی نہیں۔ ——"

"کچھ بھی ہو مدن۔ میں تمہاری شادی ضرور کروں گی ——"

"میری زندگی کیوں برباد کرنا چاہتی ہو بھابی۔ میں اس حالت میں ہی بہت خوش ہوں ——"

"تم کچھ بھی کہو۔ میں اب اپنے مدن کو کنوارا نہیں دیکھ سکتی ——"

(۵)

مدن ایک ایسی اُلجھن میں پھنس گیا تھا اُس کے دماغ نے جواب دے دیا تھا کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ کرے تو کیا کرے۔ ایک طرف بھابی کی ضد دوسری طرف جمنا کی یاد لوگوں کی زبانی پنجاب کے حالات سُنتا تھا کہ کس طرح انسان کو انسان نے بھیج کیا تھا۔ کس طرح معصوم دیویوں کی عصمت برباد کی گئی۔ کس طرح نوجوانوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا اور اُس کا دِل کانپ جاتا تھا ممکن ہو سکتا ہے بھابی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ جمنا بھی اس جہان میں نہ ہو۔ اگر ہوتی۔ تو ضرور وہ ایک نہ ایک دن یہاں پہنچ ہی جاتی باوا میر گر ہی کو ملتی

اِدھر چنچل دن بدن مدن کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جہاں مدن چنچل سے نفرت کرتا تھا۔ اُس کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اب چنچل کی ہر ایک ادا پر دل کو تھام تھام لیتا تھا۔

(۶)

کنول سین گو مدن کا بھائی تھا لیکن اُس کو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کہ اس کا چھوٹا

بھائی اتنا امیر ہے۔ لیکن کنول کے مدن کی دولت، عزت کانٹے کی طرح آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ مدن بھائی کی عزت باپ سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ لیکن اِسکے عوض کنول ہر وقت یہی سوچا کرتا کہ مدن کی یہ دھن دولت عزت و آبرو کس طرح مٹی میں ملا سکتا ہے۔ وہ اب کورٹ بھی جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی مقدمہ مل جاتا۔ لیکن تمام اخراجات کا بار مدن پر ہی تھا۔ ——

چنچل کو کنول سین کی حرکات پر شک گذرا۔ اُس نے اپنے کانوں کنول سین کی زبانی سُنا کہ یہاں اُس کی عزت نوکروں جیسی بھی نہیں۔ وہ چلا جائے گا۔ لیکن مدن کو بھی اِس کا مزہ چکھا دے گا ——

کنول سین نے مدن کے خلاف ایک گمنام چٹھی پولیس میں لکھدی کہ مدن ڈاکوؤں کا سردار ہے۔ وہ رات کے گیارہ بارہ بجے تک کوٹھی سے غائب رہتا ہے۔ اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ درپردہ وہ لوٹ کا مال لیتا ہے جسکی بدولت چند ہی سالوں میں وہ اتنا امیر ہو گیا ہے۔ کنول سین نے جب یہ چٹھی لکھی اور اپنے جیب میں ڈال لی لیکن وہ جیب کی بجائے فرش پر گر گئی۔ کنول سین تو کورٹ چلا گیا۔ چنچل جب اُس کمرے میں آئی۔ چٹھی لفافہ میں دیکھی۔ اُٹھالی اور پڑھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خیال آیا کہ یہ چٹھی مدن کو دکھا دے۔ لیکن اس ڈر سے کہ بھابی تار ا اور کنول سین ناراض ہونگے۔ اور ممکن ہے کہ اُسکے پتا اور ماتا کو بھی یہ ناگوار گذرے۔ وہ خاموش ہی رہی۔ چند ہی منٹوں میں کنول سین ہانپتا ہوا کمرہ میں

آنا دکھائی دیا۔ چٹھی وہاں ہی رکھ کر۔ چنچل وہاں سے چلی گئی۔ کنول سین نے چٹھی کو اُٹھایا سُکھ کا سانس لیا پھر چلا گیا۔

دوسرے دن پولیس نے مدن کے مکان پہ سی۔ آئی۔ ڈی کے سپاہی تعینات کر دیئے۔ وہ ہر ایک آنے جانے والے کی نگرانی کرتے۔ اُنھوں نے کافی سے زیادہ چھان بین کی ڈرائیور ہری چند کو ڈرایا بھی لیکن کچھ اصلیت معلوم نہ ہو سکی۔ ہری چند نے انہیں یہ بھی نہ بتایا کہ مدن رات کو جمنا پر غریب محتاجوں کو کھانا کھلانے جاتا ہے۔

چنچل نے جب چٹھی پڑھی اُسکے خیالات نے پلٹا کھایا۔ ممکن ——— ہے کہ مدن شریف ڈاکو ہی ہو۔ جب اُسکا بھائی اُس کو ڈاکو کہتا ہے تو اس میں جھوٹ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ وہ ایک ڈاکو سے شادی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ یہ دولت عزت جسکو وہ لالچ کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ ریت کے ایک ڈھیلے کے برابر ہے۔ ایک ہی طوفان سے اس کا نام و نشان مٹ سکتا ہے۔ اگر مدن گرفتار ہو گیا قید ہو گیا لوگ اسے کیا کہینگے۔ ڈاکو کی عورت۔ اِس سے موت بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زار زار رونے لگی اور ماں کے پاس چلی گئی۔

"ماں میں مدن سے شادی نہیں کرونگی۔ نہیں کرونگی ماں۔ کبھی نہیں کروں گی"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں چنچل ———"

"ماں۔ آج ہی یہاں سے چلے چلو۔ ایک دن بھی اب میں یہاں نہیں رہ سکتی ماں"

"اپنے پتاجی کو تو آنے دو"؟

اتنے میں منگلداس کمرہ میں داخل ہوا۔

"چنچل کہتی ہے کہ یہاں سے چلے چلو۔ اور ساتھ ہی کہ وہ مدن سے شادی نہیں کرے گی ——"

"پاگل تو نہیں ہوگئی ——"

کچھ بتاتی بھی تو نہیں۔ صرف یہی رٹ لگا رہی ہے۔ یہاں سے چلے چلو۔ شادی نہیں کرونگی ——"

اگر یہی چاہتی ہے تو آج ہی چلے چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم نے چھ ماہ مدن کے خرچ پر گذار دیئے۔ وہی ہے جس نے آج تک تیوری بھی نہیں ڈالی۔ ہم خود ہی بے شرم بن کر پڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ کون کسی کو ایک دن بھی گھر میں رکھ سکتا ہے۔ میں ابھی مکان کا انتظام کر کے آتا ہوں ——"

چنانچہ یہ کہتے ہی منگلداس باہر چلا گیا۔

منگلداس کا دوست لالہ منوہر لال وکیل تھا۔ وہ نئی دہلی کی ایک پرانی مسجد میں رہ رہا تھا۔ جونہی منگلداس نے اس بات کا تذکرہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔

یہاں آجاؤ۔ خدا کا گھر ہے۔ ہر ایک کو اس میں رہنے کا حق ہے۔ یہ ویران پڑی تھی۔ یہ دیکھو کتنی صفائی کرائی ہے میں نے۔ سجدہ گاہ کو الگ کر دیا ہے۔ وہاں ہر صبح بیٹھ کر بھگوان کی پوجا کر لیتے ہیں۔ اور خوب مزے سے دن کاٹ رہے ہیں شہر میں

تو مکانوں کی یہ حالت ہے۔ کہ دس دس ہزار روپیہ پگڑی دینے سے بھی نہیں ملتے۔

منگلداس خوش ہوگیا۔ واپس پہنچا۔ معمولی سامان جو پاس تھا سنبھالا اور کملا اور چنچل کو ساتھ لیکر بلا اطلاع دیئے چلا گیا ——— تارا نے منت سماجت کی۔ لیکن کملا اور منگلداس نے ایک نہ سُنی۔ مدن جب دوپہر کو گھر آیا۔ چنچل کو نہ دیکھ کر بھابی سے پُوچھنے لگا۔

"آج کہاں چلے گئے یہ سب ———"

"منگلداس جی نے ایک مکان لے لیا ہے۔ اور وہ چنچل کو ساتھ لے کر یہاں سے چلے گئے ہیں ———"

میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ جانا ہی تھا تو کم از کم بتا تو دیتے میں کسی اچھے سے مکان کا انتظام کر دیتا ———"

"ابھی ابھی اُن کی صلاح ہوئی اور ابھی چلے گئے ———"

(:)

مدن کے دل کو ٹھیس لگی۔ کہاں چنچل کی مُسکراہٹ، پیار۔ محبت اور کہاں اِتنی بے رُخی۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

لالہ کنول سین جب شام کو واپس آیا۔ اُس نے سی۔ آئی۔ ڈی کے سپاہیوں کو کوٹھی کے ارد گرد چکّر لگاتے دیکھا۔ لیکن وہ وہاں سے ہی واپس چلا گیا۔

اُسکو معلوم نہ تھا۔ کہ منگلداس کی لالہ منوہر لال سے دوستی ہے۔ اور منگلداس

اکثر شام کو اُس کے پاس چلا جایا کرتا ہے۔ وہ بھی وہاں جا پہنچا۔
منگلداس، چنچل اور کملا کو وہاں دیکھ کر اُس نے تعجب سے کہا۔
"تم سب یہاں چلے آئے ——— ؟"
"ہاں بھائی، چلے، چنچل کا دِل اُچاٹ ہو گیا تھا ایک منٹ کے لئے بھی وہ وہاں نہیں ٹھہرنا چاہتی۔ اسی لئے بغیر آپ سے ملے چلا آیا۔"
"اچھا ہی کیا۔ یہاں کوئی اور جگہ رہنے کے لئے نہیں؟"
"کیوں نہیں۔ یہ برآمدہ جو پڑا ہے۔ دِن تو کورٹ میں کاٹ لیتے ہیں۔ رات ہوتی ہے سونے کیلئے۔ یہاں سو جایا کرینگے۔"
"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی وہاں سے گھبرا گیا ہوں ———"
"یہ کیوں؟ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ اور پھر تمہاری تو بہت عزت کرتا ہے"
"لیکن آپ نہیں جانتے منگلداس جی یہ کوٹھی۔ شان و شوکت دھن دولت چار دِن کا کھیل ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ کہ کہیں مدن کے ساتھ ہم بھی جیل میں نہ چلے جائیں۔"
"ایسا کیوں۔ مدن تو بہت شریف ہے۔"
"لالہ جی۔ دولت یوں اکٹھی نہیں ہوتی۔ آپ بھی تو ساری عمر وکالت کرتے رہے کتنا اکٹھا کیا تھا۔ چار سال میں کوٹھیاں۔ تین چار دوکانیں بن جانا ممکن ہو سکتا ہے۔"
"میں بھی تو یہی سوچ رہا تھا اس میں کوئی راز ہے۔"
"راز کیا ہے چند دنوں میں دُنیا کو معلوم ہو جائے گا جب مدن حوالات میں ہوگا"
"تو تم بھی آج ہی چلے آؤ کنول سین تمہاری عزت پر دھبہ نہ لگے۔ تم وکیل ہو پھر ساری عمر عدالت میں کام کرنے لائق نہ رہو گے۔"
"اسی لئے تو آیا ہوں منگلداس جی۔ اب انتظام ہو گیا۔ رات کو یہیں آجاؤنگا

تارا کو لانا ہے۔ بس ——————"

(۵)

مدن جب شام کو دوکان سے واپس آیا۔ تو نوکر نے بتایا۔ کہ بھائی صاحب اور بھابی اپنا سامان سنبھال کر کہیں چلے گئے۔ مدن کی کچھ سمجھ نہ آیا۔ کہ یہ کیا بھید ہے۔ کیوں منگلداس جی اور چنچل چلے گئے۔ اب یہ بھی چلے کے مجھے بتایا بھی نہیں۔ اچھا اُن کی مرضی۔ میں نے تو کبھی اُن سے کچھ نہیں کہا تھا۔

"رادھو۔ تم نے تو کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہی تھی جس سے اُن کو غصہ آگیا ہو"

"نہیں بابو جی۔ میں تو اُن کی آپ سے بھی زیادہ خدمت کرتا تھا۔"

(۵)

پولیس کئی دن سے مدن کا پیچھا کر رہی تھی لیکن بھی اصل راز کو نہ جان سکی اسکی وجہ یہ تھی کہ مدن کار میں بیٹھ کر جاتا۔ کار میں ہی بھیس بدل لیتا۔ ایک بوڑھا سیٹھ۔ سفید ڈاڑھی۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ اور وہ بھی سفید سر پر پگڑی۔ گلے میں دوپٹہ اور ہر روز ایک تھیلی ساتھ لے جاتا۔ جمنا بل کے کبھی اِدھر کبھی اُدھر کار کو کھڑی کر کے پیادہ نکل جاتا۔ اور غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ کر ایک جھونپڑی میں آکر مصنوعی ڈاڑھی ——— اُتار کر کار میں واپس آجاتا۔ ———

(۵)

موہن لال بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اُس نے کبھی بوجھ نہ اُٹھایا تھا۔ ہر روز کی محنت مشقت نے اُس کی کمر توڑ دی۔ بخار دن بدن تیز ہوتا گیا۔ اور آخر ایک رات کو بارہ بچے دکھوں کی زندگی سے نجات حاصل کر گیا جمنا بے سہارا رہ گئی۔ پردیس اور پھر کوئی مددگار نہیں۔ باپ کا سنسکار کر کے اپنی جھونپڑی میں آئی۔ جھونپڑی اُس کو کھانے

کو دوڑتی تھی جمنا کی صحت تو پہلے گر چکی تھی۔ اب باپ کے مرنے کے بعد اُس کی حالت اور کمزور ہو گئی۔ ساتھ کے مکان میں جیون رہتا تھا۔ اُس کا لڑکا منگل آٹھ سال کا ہوگا۔ وہ جمنا کے پاس آیا۔

"بہن۔ کھانا نہیں کھاؤ گی ——؟"

"منگل پاس ہے ہی کیا جو کھاؤں ——"

"جو رات کو سیٹھ آتا ہے۔ اُس سے کیوں نہیں مانگ لیتی ——"

"اسدن تک ہاتھ نہیں پھیلایا منگل ——"

"موت سے بھیک مانگ لینی اچھی ہے۔ آج میں تمہارے لئے مانگ لاؤں گا۔"

"ایسا نہ کرنا منگل ——"

"منگل چلا گیا۔ وہ ہر رات سیٹھ مدن سے جمنا کے لئے مانگ کر لے آتا تھا۔

پولیس کو بھی مدن پر شک ہو گیا تھا کہ واقعی وہ رات کو کسی خفیہ جگہ جاتا ہے اور تھیلی میں کچھ لاتا ہے۔ پولیس نے کافی چھان بین کی۔ پہلی ہسٹری دریافت کی۔ یہ بھی پولیس کو معلوم ہو گیا کہ مدن جب آیا تھا۔ چاندنی چوک کی پٹڑی پر کھڑا ہو کر رومال بیچا کرتا تھا۔ چار سال میں اِس قدر دولت کا اکٹھا ہو جانا واقعی کوئی راز تھا۔ چنانچہ پولیس نے چند بناوٹی گواہان سے اپنی مرضی کے مطابق بیان لکھوا کر مدن کو گرفتار کر لیا۔ اور مقدمہ میں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ وہ کسی خفیہ ڈاکوؤں کے گروہ کا راز دار ہے۔ دہلی میں چوری کے واقعات بھی عام ہو رہے تھے۔ جس سے مدن کے خلاف مقدمہ کو تقویت ملتی تھی۔

عدالت میں گواہان کے جھوٹے بیان ہونے کے بعد مدن کا بیان قلمبند ہوا۔

مدن نے اقبال کیا۔ کہ وہ شام کو بھیس بدل کر جاتا ہے۔ لیکن کہاں جاتا ہے۔ اس کے لئے اُس نے صرف اتنا کہا۔ کہ جمنا پر مجھے لے چلئے۔ اور خود موقعہ ملاحظہ فرمالیجئے۔

عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ شہر میں۔ اخبار میں۔ جہاں دیکھو مدن کا تذکرہ تھا۔ ایک شریف ڈاکو نے چار سال میں لاکھوں روپیہ کیسے اکٹھا کر لیا۔ جب مدن نے عدالت کو موقعہ ملاحظہ کرنے کے لئے کہا۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ چنانچہ عدالت نے دوسرے دن پر مُقدمہ کو ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن شام کو ۴ بجے ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا مدن جمنا کے کنارے لیجایا گیا۔

"کون سی وہ جگہ ہے ——————؟ مدن نے ایک جھونپڑی میں لے جا کر کہا یہہ ہے۔ دو منٹ ٹھہریئے میں بھیس بدل لوں چنانچہ اُس نے ایک خفیہ جگہ سے نقلی ڈاڑھی مونچھیں وغیرہ نکالیں اور پہن لیں۔

مجسٹریٹ مدن کو اس شکل میں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ "اچھا بتاؤ۔ وہ جگہ۔ جہاں نوٹ بنانے کا کارخانہ ہے ——"

"چلئے ——"

وہ محتاجوں۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کے پاس آگیا۔ ان مانگنے والوں نے جب سیٹھ مدن کو دیکھا۔ زار و قطار رونے لگ پڑے۔ آن کی آن میں ہزاروں غریب اکٹھے ہو گئے ——

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ——؟"

"جناب۔ ہمارے بھگوان کو آپ نے قید کر لیا ہے اب ہم کیسے جئینگے۔ کون ہمیں کھانا کھلائے گا۔ کون ہمیں کپڑا دے گا۔ ہم بھوکے مر جائینگے سرکار۔ بھوکے۔ سیٹھ جی کو

ڑ دیجئے جمنا بھی اُن میں موجود تھی۔

"جناب یہی میری دولت کا راز ہے۔ انہی غریبوں محتاجوں کو ہر روز شام کو کھانا کھلانے سے میری یہ شان و شوکت۔ عزّت۔ آبرو۔ دھن دولت اکٹھی ہے۔ یہی میرا نوٹ بنانے کا کارخانہ ہے حضور۔

مجسٹریٹ صاحب آخر انسان تھے غریبوں کی چیخ و پُکار سے انہیں مدن کی بے گناہی کا یقین آگیا

مدن نے اپنی مصنوعی ڈاڑھی اُتاری۔ سب غریب حیران تھے۔ کہ شہر کا مشہور سیٹھ مدن لال۔ اپنے ہاتھوں اُن کو کھانا کھلاتا ہے۔

اور بھاگ کر آگئی۔ جمنا نے مدن کو اصلی شکل میں دیکھا۔

"مدن۔ بابو ——"

"مدن کے کانوں میں جمنا کی مدھر آواز گونجی۔

"جمنا۔ میری جمنا —— پیاری جمنا۔"

آسمان سے بارش ہو رہی تھی اور ہم پہلو بہ پہلو ستاروں کے سائے تلے واپس پلٹے اور اس دن سے آج تک یُوں ہی شانہ بہ شانہ سفینۂ حیات پر رواں دواں بہے چلے جا رہے ہیں —— اور شاید موت کے بعد بھی یہ ساتھ نہ چھُوٹے

ALLAMA IQBAL LIBRARY
27641

اس مجموعہ میں شائع ہونے والے تمام نام۔کردار و واقعات تخیلی ہیں اتفاقیہ مطابقت
کیلئے مصنف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN